Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1962ء

اسلامی نظام مملکت کی خصوصیات

اس میں

(۱) ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے، یکساں عزت کا مستحق ہوگا (۱۷/۷۰) ۔

(۲) معاشرہ میں مدارج کا معیار، کردار کی بلندی اور حسن عمل ہوگا (۴۹/۱۳) ۔

(۳) تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی — روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ — کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی (۶/۱۵۲؛ ۲۰/۱۱۸) ۔

(۴) ہر ایک سے عدل ہوگا — حتکہ دشمن سے بھی ۔ اور جس میں کسی وجہ سے کوئی کمی رہ جائیگی، اسکی کمی کو پورا کیا جائیگا (۱۶/۹۰؛ ۵/۸) ۔

(۵) فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں تمام نوع انسان کی منفعت کے لئے استعمال کیا جائیگا (۳۲/۲؛ ۱۳/۴۵) ۔

(۶) ہر معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہوگا ۔ اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہوگی ۔ کوئی فرد نہ کسی دوسرے فرد کا محکوم ہوگا، نہ محتاج (۵/۴۴؛ ۳/۷۸) ۔

طلوع اسلام پاکستان میں اسی نظام کے قائم کرنے کا داعی ہے

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک
ہندوپاکستان سے سالانہ ۸ روپے
غیرممالک سے سالانہ ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوپاکستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۷۵۰۰
خط وکتابت کا پتہ:-
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

جلد (۱۵) نومبر سنہ ۱۹۶۲ء نمبر (۱۱)

فہرست مضامین

لمعات ———— ۲
نکاح کی عمر ———— ۹
اسلام میں جھوٹ بولنے کی اجازت؟ ———— ۱۲
دین کے اصولوں میں لچک (ایک اہم سوال) ———— ۱۹
عائلی قوانین پر اعتراضات ———— ۲۳
استفسارات (قرآن کا معاشی نظام) ———— ۲۶
ایک سہیلی کے نام خط (عورت کا مقام) ———— ۳۱
مجلس اقبالؒ (مثنوی - پس چہ باید کرد) ———— ۳۵
حقائق و عبر (۱) ذوق کے بغیر اسلام (۲) فتنۂ انکارِ حدیث کس طرح مٹ سکتا ہے؟ (۳) کافرگری ———— ۴۲
رابطۂ باہمی (راولپنڈی سب کنونشن) ———— ۴۷
تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے ———— ۵۰
احتساب ———— ۶۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ممبرانِ اسمبلی کی خصوصی توجہ کیلئے

آج کل یہ سوال عام طور پر دہرایا جاتا ہے کہ پاکستان کے سب سے اہم اور بنیادی مسائل کیا ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب ہر صاحبِ فکر اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے دیگا۔ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے، پاکستان کا ایک ہی اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ نے اس کی حالت، بھنور میں گھری ہوئی کشتی کی سی کر رکھی ہے۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا اس ملک کا قدم کسی سمت بھی آگے نہیں اٹھ سکتا۔ اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ

اس ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔

اس ملک کو حاصل ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور ہمارا معاشرہ اسلامی خطوط پر متشکل ہو جائے۔ لہٰذا اس باب میں دو رائیں ہو نہیں سکتیں کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں لیکن مشکل یہ ہے کہ جس قدر یہ مسئلہ نظری طور پر متفق علیہ ہے اسی قدر عملی حیثیت سے مختلف فیہ ہے۔ یہاں

باہمی اختلافات

مختلف فرقے بستے ہیں۔ اور ہر فرقے کا اسلام کا تصور الگ ہے۔ اس قدر الگ کہ اہل سنت والجماعت کے دو فرقوں کے متبعین اس بات پر بھی متفق نہیں کہ بیوی کو طلاق دینے کا اسلامی طریق کون سا ہے۔ جس طریق کو ایک فرقہ عین مطابق اسلام قرار دیتا ہے، دوسرا فرقہ اس طریق کو اسلامی شریعت کے خلاف ٹھہراتا ہے۔ جب اس قدر چھوٹے چھوٹے فرعی مسائل میں ان کے اختلاف کا یہ عالم ہے تو ملک کے اہم اجتماعی مسائل کے متعلق ان کے اختلافات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر ان اختلافات کی شدت کی یہ کیفیت ہے کہ (مثلاً) مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب فرماتے ہیں کہ

مولانا مودودی صاحب اپنی ان کتابوں کو جلادیں جن میں قابل اعتراض باتیں ہیں۔ اگر وہ ایسا کرنے کو تیار ہیں تو ہم ان کے ساتھ شامل ہونے کو تیار ہیں۔ (شہباز۔ ۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

اور ان میں سے کوئی فرقہ ایسا نہیں جس نے دوسرے فرقہ کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ لگایا ہو ان حالات کے پیش نظر آپ سوچئے کہ ملک کیلئے ایسے قوانین مرتب کرنا جنہیں یہاں کے لینے والے تمام مسلمان اسلامی تسلیم کرلیں اور ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوسکے کس قدر مشکل ہے۔ یہی وہ مشکل تھی جو پاکستان کے سب سے پہلے آئین کی تدوین کے سلسلے میں پیش آئی۔ اس وقت بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے یہ تجویز کیا تھا کہ ایک علماء بورڈ قائم کیا جائے جو ہر مجوزہ قانون کے متعلق طے کرے کہ وہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہ تجویز اس قدر مشکلات سے معمور اور خطرات سے پُر تھی کہ اسکی ہر طرف سے مخالفت ہوئی۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اس قسم کے بورڈ کا تقرر ہی سرے سے ناممکن تھا۔ اگر وہ بورڈ مختلف فرقوں کے علماء پر مشتمل ہوتا تو ہر مسئلہ زیر غور پر ان میں باہمی سر پھٹول شروع ہو جاتی اور کسی معاملہ میں متفق علیہ فیصلہ ہو ہی نہ پاتا۔ اور اگر وہ بورڈ کسی ایک فرقہ کے علماء سے ترتیب پاتا تو اس کا فیصلہ دوسرے فرقہ والوں کے نزدیک کس طرح اسلامی قرار پاسکتا؟ اگر بفرض محال ایسا بورڈ عمل میں آبھی جاتا تو قانون سازی کا اقتدار اعلیٰ اس بورڈ کو حاصل ہوتا کیونکہ جس قانون کے متعلق وہ کہہ دیتا کہ وہ اسلام کے مطابق ہے اسے منظور کرنا پارلیمنٹ کے لئے ضروری اور اسے ملک میں نافذ کرنا حکومت کا فریضہ ہو جاتا۔ اور جس مسودہ قانون کو وہ غیر اسلامی قرار دے دیتا اسے نہ پارلیمان منظور کرسکتی نہ حکومت نافذ۔ اس صورت میں پارلیمنٹ کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ قانون سازی کے کلی اختیارات علماء بورڈ کے ہاتھ میں ہوتے اور حکومت ان کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی مشین ہوتی۔ یہ تھیاکریسی کی وہ بدترین شکل تھی جو علم و بصیرت، آزادی، جمہوریت بلکہ انسانیت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہے۔

علماء بورڈ

کس قسم کے قانون بنتے!

ان حضرات نے قانون کس قسم کے بنانے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہی دنوں کراچی میں ان حضرات کی طرف سے یہ آواز اٹھی تھی کہ میڈیکل کالج میں جو مردے چیر پھاڑ کیلئے لائے جاتے ہیں یہ شرعاً ناجائز ہے کیونکہ اس سے مردوں کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ اس سے ملک کے سمجھدار اور پڑھے لکھے طبقہ کے دل میں احساس پیدا ہوا کہ اگر کہیں یہی مسئلہ ملک کا قانون بن گیا تو میڈیکل کالجز بند کرنے پڑیں گے۔ کیونکہ جب مردے ہی دستیاب نہیں ہوں گے تو طالب علموں کو اناٹمی (تشریح الابدان) کی تعلیم کیسے دی جائے گی۔ (حال ہی میں جامعہ ازہر قاہرہ کے علماء کرام نے فتویٰ دیا ہے کہ مسلمان کا خون غیر مسلم مریض کے اور غیر مسلم کا خون مسلمان مریض کے جسم میں داخل نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی کافر کی آنکھ مسلمان کی پیشانی میں پیوست کی جاسکتی ہے) کس طرف سے یہ آواز اٹھ رہی تھی کہ جنگ کی صورت میں دشمن کی قیدی عورتوں کو از روئے شریعت لونڈیاں بنایا جائے گا۔

اور یہ چیز ہمارے ضابطہ قوانین و آئین کا جزو ہوگی۔ کہیں یہ کہا جا رہا تھا کہ جس شخص کے عقائد کے متعلق علماء حضرات فتویٰ دے دیں گے کہ وہ اسلام کے مطابق نہیں اسے مرتد قرار دیا جائے گا۔ اور اس کی سزا قتل ہوگی۔ وقس علیٰ ہذا۔ ان آوازوں کو سن سن کر باہوش اور حساس طبقہ فطرۃً مضطرب خائف تھا کہ یا خدا! یہاں کیا ہونے والا ہے۔ بالآخر دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی اور آئین سازی کا کام بارِ دگر شروع ہوا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین میں یہ شق رکھی گئی کہ ملک کا کوئی قانون

۱۹۵۶ء کا آئین

کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس پر یہ بحث شروع ہوگئی کہ سنت کہتے کسے ہیں۔ اور وہ کہاں ملیگی۔ حسب معمول ان بحثوں نے ایسا طول کھینچا کہ ایک فریق نے دوسرے فریق سے کہا کہ جن باتوں کو آپ سنت قرار دے رہے ہیں۔

> انہیں سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے۔ جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔

فریق مخالف نے اس کے جواب میں کہا کہ سنت کے بارے میں جو مضحکہ انگیز پوزیشن آپ اختیار کر رہے ہیں۔

> ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کرینگے اور سنت رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

یہ تو غنیمت ہوا کہ ۱۹۵۶ء کا آئین کالعدم قرار پا گیا اور اس اصول کے مطابق قانون سازی کا عملاً موقع ہی نہ آیا، ورنہ نہ معلوم ان حضرات میں کس قدر سر پھٹول ہوتی۔

۱۹۶۲ء کا آئین

۱۹۶۲ء کے آئین میں یہ شق رکھی گئی ہے کہ یہاں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو "اسلام" کے خلاف ہو۔ اس شق میں پہلے سے بھی زیادہ اختلافات کی گنجائش ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہاں ہر فرقہ کا اسلام کا تصور الگ الگ ہے۔ اس مقصد کے لئے اگرچہ ایک اسلامی مشاورتی کونسل کا بھی تقرر ہوا ہے لیکن قانون سازی کی آخری اتھارٹی پارلیمنٹ کو قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو قانون پارلیمنٹ پاس کردیگی (اور وہ صدر مملکت کی منظوری کے بعد نافذ ہو جائے گا) آئینی طور پر وہ اسلامی متصور ہوگا۔ لیکن ہمارے علمائے کرام کی طرف سے ابھی سے یہ آوازیں اٹھنی شروع ہوگئی ہیں کہ اگر پارلیمنٹ بھی کوئی ایسا قانون منظور کردے گی جو ان حضرات کے نزدیک اسلامی نہیں ہوگا تو مسلمان اس قانون کی اطاعت نہیں کرینگے (مثلاً) عائلی قوانین کے سلسلے میں، مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب نے (مولانا مودودی صاحب کی ہم نوائی میں) فرمایا ہے کہ

اگر ان قوانین کو قومی اسمبلی منسوخ کر دے تب بھی مسلمان ان پر عمل پیرا نہیں ہوں گے (کوہستان ۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

حتیٰ کہ انہوں نے یہ بھی کہا ہے۔

خدانخواستہ اگر موجودہ حکومت کو غیر مسلم حکومت تصور کر لیا جائے تب بھی مسلمانوں کے شخصی قوانین میں حکومت کو مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ (ایضاً)

یعنی ان کے نزدیک مسلمانوں کے پرسنل لاز (شخصی قوانین) میں حکومت کو مداخلت کا حق ہی حاصل نہیں — یہیں تک ہی نہیں۔ یہاں ایک گروہ ایسا بھی ہے جن کا کہنا یہ ہے کہ حکومت (شخصی یا مدنی) قوانین انہی کے لئے مرتب

کوئی قانون بنایا ہی نہیں جاسکتا

اور نافذ کرسکتی ہے جو اجتہاد کو جائز سمجھتے ہیں۔ جو مسلمان اجتہاد کو جائز ہی نہیں سمجھتے ان کے لئے حکومت کوئی قانون بنا ہی نہیں سکتی۔ (مثلاً) اس سلسلے میں روزنامہ جنگ (راولپنڈی) کی ۵ اکتوبر کی اشاعت میں محترم محمد عبدالغفار خیری صاحب کا ایک مکتوب شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

پاکستان میں متعدد مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ ہندو مسلمان سکھ۔ عیسائی۔ یہودی۔ آدی باسی وغیرہ۔ ان مذاہب میں سے بعض کے فرقے بھی ہیں۔ مثلاً ہندوؤں میں سناتن دھرم۔ آریہ سماج۔ جین وغیرہ مسلمانوں میں اہل حدیث۔ احناف۔ مالکی۔ شافعی اور حنبلی وغیرہ عیسائیوں میں مختلف چرچ۔ ہم اخبارات میں یہ دیکھتے ہیں کہ سب اہل مذاہب کو یہاں آزادی حاصل ہے لیکن مسلمانوں کی مذہبی آزادی کو حکومت سلب کر رہی ہے۔ (عائلی قوانین۔ حکومت کے تربیت کردہ امام کے ذریعے مساجد پر قبضہ وغیرہ) ہم حکومت کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ آج کی دنیا میں اسلام کے نام پر صرف ایک ہی ادارہ نہیں ہے بلکہ اسی نام پر متعدد ادارے ہیں جن میں باہمی آشکارہ اختلافات ہیں یعنی بعض تو مذہب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یعنی (۱) اصول (۲) فروع اور فروع میں اختلافات کو جائز سمجھتے ہیں یعنی کچھ اپنی اپنی اور بعض کا عقیدہ ہے کہ کل من عند اللہ یعنی جن کو اصول کہا جاتا ہے وہ بھی اور جن کو فروع کہا جاتا ہے وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ان میں سے کسی میں اختلاف جائز نہیں۔ اس حالت میں وہ جو فروع میں اختلاف جائز سمجھتے ہیں اور دین میں اجتہاد کے قائل ہیں وہ غالباً ہر شورہ کو ہر اجتہاد کو مان لیں گے لیکن جو اس کے قائل نہیں اور دین میں اجتہاد کو جائز نہیں سمجھتے وہ تو حکومت کی ہو یا کسی اور کی ہر دسترس کو اپنے دین میں مداخلت اور سلب آزادی دینی قرار دینگے اور جہاں تک میرا علم ہے حکومت نے مذہبی آزادی کی حفاظت کا آئین میں اعلان کیا ہے۔ ایسی حالت میں دین کے متعلق جو کارروائی کی جائے وہ انہیں

فرقوں اور اداروں کے لئے مخصوص ہونی چاہیئے جو اس کی خواہش کریں یا اس کو برضا و رغبت تسلیم کریں اور جو اس کو مذہبًا تسلیم نہ کریں، اور ہر دست اندازی کو مداخلت فی الدین سمجھتے ہیں ان کو ان امور سے مستثنیٰ کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ حکومت جبراً کتاب و سنت کو ترک کرا کے ایک نئے اجتہاد اور اس پر مبنی ایک نئے مذہب کو منوانا چاہتی ہے۔ حکومت کے لئے مناسب و درست یہ ہے کہ اس مسئلہ پر بذریعہ ایک سوالنامہ کے استصواب فرمائے کہ کون اس کو پسند کرتا ہے اور کون اپنے دین میں کسی اجتہاد یا رائے یا مشورے کو جائز نہیں سمجھتا۔

آپ ان حالات کو سامنے رکھیئے اور پھر سوچیئے کہ یہ جو ہم نے سترہ برس میں کہا ہے کہ پاکستان کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ ایک ہی ہے اور وہ ہے قانون سازی کا — یہ کس قدر صحیح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قانون سازی تو ایک طرف ملک کے مفاد اور مصالح کے لئے کوئی قدم اٹھانا چاہیئے۔ اس میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آ جاتا ہے کہ وہ اقدام شریعت کی رو سے کیسا ہے۔ کوئی اس کے حق میں کہتا ہے۔ کوئی خلاف جاتا ہے۔ اور حکومت عجیب کشمکش میں گرفتار ہو جاتی ہے کہ وہ کرے تو کیا کرے۔

یہ ہیں وہ حالات جن کے پیشِ نظر ایک طبقہ تنگ آکر یہ کہنے لگ جاتا ہے کہ اس مسئلہ کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے اور ملک کے قوانین سیکولر انداز سے مرتب کئے جائیں۔ حالات سے

دل برداشتہ طبقہ

دل برداشتہ ہو کر ان کا اس نتیجہ پر پہنچنا ایک لحاظ سے حق بجانب ہے، لیکن آپ سوچئے کہ ہماری اس روش کا مطلب کیا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے نزدیک (۱) اسلام میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ ایک مملکت کا آئین بن سکے۔ اور (۲) ہم نے جو دعویٰ کیا تھا کہ ہم ایک ایسا خطۂ زمین چاہتے ہیں جس میں اسلام ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے سامنے آسکے۔ وہ محض ایک سیاسی حربہ تھا۔ (حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط اور یکسر غلط ہیں)۔

اگر یہ باتیں غلط ہیں تو پھر سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس اہم ترین اور بنیادی مسئلہ کا حل کیا ہے؟ حل اس کا وہی ہے جسے ہم سترہ برس سے پیش کرتے اور بار بار دہراتے چلے آرہے ہیں۔ یعنی یہ کہ ان تمام اختلافات کے

قدرِ مشترک

باوجود کیا کوئی ایسی قدرِ مشترک بھی ہے جس پر تمام مسلمان متفق ہیں؟ آپ جس سے جی چاہے اس سوال کو پوچھ کر دیکھ لیجئے۔ اس کا ایک ہی جواب ملے گا۔ اور وہ یہ کہ یہ قدرِ مشترک قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ ہر فرقہ اور ہر خیال کا مسلمان اسے حرفاً حرفاً منزل من اللہ سمجھتا ہے اور دین میں آخری

حجت تسلیم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کی یہ پوزیشن نہیں۔ جب آپ کسی کے سامنے قرآن کی آیت پیش کریں تو وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ ـــ معلوم نہیں یہ قرآن کی آیت ہے بھی یا نہیں۔ لیکن احادیث کے متعلق (خود احادیث کے متبعین کے نزدیک) کیفیت یہ ہے کہ

> کوئی روایت جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی حجت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں مانتے۔
>
> (رسائل و مسائل ۲۹۰)

یعنی متبعینِ حدیث کے نزدیک سرے سے یہ امر ہی متنازعہ فیہ ہوتا ہے کہ جس حدیث کو حدیثِ رسولؐ کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے وہ درحقیقت رسول اللہؐ کی حدیث ہے بھی یا نہیں۔ قرآن کی کسی آیت کے متعلق ایسا نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم کو آخری سند و حجت تسلیم کرنے کے یہ معنی نہیں کہ غیر از قرآن جو کچھ ہمارے ہاں ہے اسے "دریا برد" کر دیا جائے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھ لیا جائے جو اس کے مطابق ہو اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔ اسی سے اختلافات دور ہو سکتے ہیں۔

اس مقام پر کہہ دیا جاتا ہے کہ قرآن کریم کا متن (TEXT) تو متفق علیہ ضرور ہے۔ لیکن اس کی تعبیرات میں اختلاف ہے۔ اس لئے اس سے بھی اختلافات کس طرح رفع ہو سکتے ہیں؟ ذرا غور کیجئے کہ ایسا کہنے کا مطلب کیا ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا بھر کے اختلافات مٹانے کے لئے آیا ہے۔ اس کے اپنے اندر کوئی اختلافی بات نہیں۔ وہ صاف، واضح، نکھری ہوئی زبان کی کتاب ہے اس نے اپنے احکام نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دئے ہیں۔ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ کہیں ابہام نہیں۔ کیا ایسی کتاب کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے اپنے احکام اس طرح بیان کئے ہیں کہ ان سے مختلف اور متضاد مفہوم لیا جا سکتا ہے؟ (مختلف تعبیرات اسی صورت میں لی جا سکتی ہیں جب کہنے والے کی بات واضح نہ ہو اور اسے ایسے الفاظ میں کہا جائے جن سے مختلف مفہوم نکالے جا سکیں) کیا آپ کا ایمان ہے کہ خدا کی یہ آخری کتاب اسی قسم کی ہے؟ یہ تو تصنیف کا ایسا بنیادی نقص ہے کہ اگر خود ان لوگوں سے (جو کہتے ہیں کہ قرآن سے مختلف تعبیرات لی جا سکتی ہیں) یہ کہا جائے کہ ان کی تحریروں کا یہ عالم ہے کہ ان سے مختلف تعبیرات لی جا سکتی ہیں تو وہ اسے سننا تک گوارا نہ کریں۔ حیرت ہے کہ یہ حضرات اپنی تحریروں اور کتابوں میں جس بات کو اس قدر معیوب قرار دیتے ہیں

تعبیرات کا اختلاف

کہ اس کا سننا تک گوارا نہیں کرتے۔ اسے بلا جھجک خدا کی کتاب کی طرف منسوب کرتے چلے جاتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک (معاذ اللہ) خدا کو اپنی بات کہنے کا عام مصنفین جیسا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ یاد رکھئے خدا کی کتاب ان تمام اتہامات سے پاک اور بلند ہے۔ جسے یہ لوگ قرآن کی مختلف تعبیرات کہتے ہیں وہ قرآن کی تعبیرات نہیں ہوتیں۔ ان کے اپنے معتقدات اور خیالات ہوتے ہیں۔ خدا نے جن قدر احکام اپنی کتاب میں دئے ہیں ان کے دو معنی نہیں ہو سکتے۔ جن حقائق کو قرآن نے تشبیہات کے انداز میں بیان کیا ہے (انہیں آیات متشابہات کہتے ہیں) ان کا مفہوم سمجھنے میں انسانی علم و عقل کے تفاوت سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن احکام کی ایسی صورت قطعاً نہیں ــــ اور قانون کا تعلق ہوتا ہی احکام سے ہے لہٰذا یہ کہنا غلط ــــ اور قرآن کے بنیادی دعوے کی (معاذ اللہ) تردید تکذیب ہے ــــ کہ قرآن کو سند و حجت قرار دینے سے بھی اختلافات نہیں مٹ سکتے۔

لہٰذا ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) اسے آئینی طور پر تسلیم کیا جائے کہ پاکستان میں کوئی قانون، قرآن کریم کے خلاف نہیں بنے گا۔

(۲) باہمی مشاورت سے قانون سازی کی ایک اتھارٹی مقرر کی جائے۔ (مثلاً پارلیمنٹ)۔

(۳) اگر کسی کو اس اتھارٹی کے مرتب کردہ قانون سے اس بنا پر اختلاف ہو کہ وہ قرآن کے خلاف ہے تو اس کے لئے عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۴) قوانین میں تغیر و تبدل کے لئے آئینی طریق اختیار کیا جائے۔ یہ نہیں کہ جس قانون کے متعلق کوئی شخص خیال کرے کہ وہ "اسلام" کے خلاف ہے اس کی خود بھی خلاف ورزی شروع کر دے۔ اور دوسرے لوگوں کو بھی خلاف ورزی کے لئے اکسایا جائے۔

اگر ایسا کر لیا گیا تو یہاں قانون کی فرماں روائی اور مملکت کے استحکام کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ ورنہ موجودہ انتشار بڑھتا چلا جائے گا اور اس کا جو انجام ہو سکتا ہے وہ ہر دیدہ بینا پر واضح ہے۔

نکاح کی عمر

قرآن کریم نے نکاح کے لئے بلوغت کو شرط قرار دیا ہے۔ لیکن ہمارا قدامت پسند طبقہ نابالغ کی شادی کو بھی جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے لئے ان حضرات کے پاس قرآن کریم سے کوئی سند نہیں ہو سکتی۔ لیکن پچھلے دنوں دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ سورۂ طلاق کی ایک آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خود قرآن سے بھی نابالغ کا نکاح ثابت ہوتا ہے۔ اس سورہ میں عدت کے سلسلے میں آیا ہے کہ وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ ۔ تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں، ان کے بارے میں اگر تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہوگی۔ یعنی مطلقہ عورت کی عدت تو تین حیض ہوتی ہے (۲/۲۲۸) لیکن اگر کوئی عورت اس قدر سن رسیدہ ہو چکی ہے کہ اسے حیض آنے کی امید نہیں رہی تو اس کی عدت تین ماہ شمار کر لینی چاہیئے۔ اس کے بعد ہے۔ وَالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ۔ (۶۵/۴) یہی عدت (تین ماہ) ان عورتوں کی بھی ہوگی۔ جنہیں حیض نہیں آتا۔ اس سے یہ لوگ مراد لیتے ہیں ایسی نابالغ لڑکیاں جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ان نابالغ لڑکیوں کی شادی جائز ہے۔ کیونکہ اگر ان کی شادی کی اجازت نہ ہوتی تو ان کی عدت بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس آیت کا یہ مطلب (کہ اس سے مراد وہ نابالغ لڑکیاں ہیں جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو) غلط ہے اور جب یہ مطلب ہی غلط ہے تو اس سے جو نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے وہ خود ہی غلط ہوگا۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس آیت کا صحیح مطلب بیان کریں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کیا قرآن کریم نے نکاح کے لئے عمر کا تعین کیا ہے اور اگر کیا ہے تو وہ عمر کیا ہے؟

۲۔ سورۂ نساء میں ہے۔ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ۔ (۴/۶) مختلف مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ حسب ذیل کیا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ ۔ وامتحان کنید یتیماں را یعنی در ایام صبا تا آنکہ رسند بہ حد نکاح

اس ترجمہ کے نیچے تفسیر حسینی شائع ہوئی ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ وایں کنایت از بلوغ است (اس سے بلوغت کی طرف کنایہ ہے)۔

شاہ عبدالقادرؒ۔ اور آزمایا کرو یتیموں کو۔ یہاں تک کہ جب پہنچیں نکاح کو۔ اس کے حاشیہ میں (موضح القرآن کا نوٹ ہے کہ) جب یتیم بالغ ہو تو اس کا مال اس کے حوالہ کیا جائے۔

مولانا محمود الحسنؒ۔ اور سدھاتے رہو یتیموں کو جب تک پہنچیں نکاح کی عمر کو۔ اس کے حاشیہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا نوٹ ہے۔ یعنی یتیموں کو سدھاتے اور آزماتے رہو بلوغت کے وقت تک۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم۔ اور یتیموں کی حالت پر نظر رکھ کر انہیں آزماتے رہو (کہ ان کی سوجھ بوجھ کا کیا حال ہے) یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ اسکے نیچے ان کا اپنا نوٹ ہے یعنی جب وہ سن بلوغت کے قریب پہنچ رہی ہوں تو دیکھتے رہو کہ ان کا عقلی نشوونما کیسا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ (۱) قرآن کریم نے نکاح کی عمر کا تعین خود کر دیا ہے۔ اور (۲) وہ عمر بلوغت کی ہے۔ اس کی تصریح قرآن کریم نے بھی دیگر مقامات میں کر دی ہے۔ سورۃ نساء کی مندرجہ بالا آیت میں حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ انعام میں اسی حکم کے لئے یہ الفاظ آئے ہیں۔ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (۶/۱۵۲) یہاں تک کہ یتیم اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ (نیز ۱۷/۳۴) خود "اشد" کے متعلق دوسرے مقامات پر بتا دیا کہ یہ بچپن اور بڑھاپے کی درمیانی عمر ہے (ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ——— (۴۰/۶۷)۔ ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ کیا اس میں کسی شبہ کی بھی گنجائش ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نکاح کی عمر بلوغت یا جوانی ہے۔ اس سے کم عمر نکاح کی عمر نہیں ہے۔ قرآن کریم کی ایسی واضح تصریحات کے بعد یہ کہنا کہ قرآن کریم ہی کے دوسرے مقام سے یہ ثابت ہے کہ نابالغ کا نکاح بھی ہو سکتا ہے، بالفاظ صریح یہ کہنا ہے کہ قرآن میں تضاد ہے۔ حالانکہ اس کا دعویٰ ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

۲۔ اب دیکھئے کہ سورۃ طلاق کی محولہ بالا آیت کا مفہوم کیا ہے سورۃ بقر میں ہے۔ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ——— (۲/۲۲۸) اور طلاق دی ہوئی عورتیں تین حیض تک کا انتظار کریں۔ یعنی مطلقہ عورت کی عدت تین حیض کی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جن عورتوں کو حیض نہیں آتا ان کی عدت کا شمار کس طرح کیا جائے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے بتایا کہ اس ضمن میں دو قسم کی عورتیں آئیں گی۔

ایک وہ جو اس قدر عمر رسیدہ ہو چکی ہوں کہ انہیں حیض آنے کی امید ہی نہ رہی ہو اور دوسری وہ جو عمر کے اعتبار سے تو ایسی ہوں جنہیں حیض آسکتا ہے۔ لیکن انہیں بیماری وغیرہ کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو ان کی عدت تین حیض کے بجائے تین ماہ شمار ہوگی۔ (۶۵/۴) باقی رہیں وہ نابالغ لڑکیاں جنہیں ہنوز حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا تو جب قرآن کی رو سے ان کا نکاح ہی نہیں ہو سکتا تو ان کی عدت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا شمار وَالّٰئِي لَمْ يَحِضْنَ میں نہیں ہوگا۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم کے ایسے واضح احکام کے بعد اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ نابالغ کا نکاح بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم پر کس قدر زیادتی ہے۔ آپ نے سوچا ہے کہ قرآن کریم کو اس طرح توڑنے مروڑنے کی یہ کوششیں کیوں ہورہی ہیں محض اس لئے کہ ہمارے ہاں کسی طرح سے نابالغ کی شادی کا رواج پڑ گیا اور وہ رواج ابھی تک چلا آرہا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ ہم ایسے رواج کو ختم کریں جو قرآن کریم کے خلاف ہے۔ خود قرآن کو اس رواج کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے نکاح کے لئے بلوغت کو شرط قرار دیا ہے۔ لڑکا اور لڑکی کس عمر میں بالغ ہو جاتے ہیں اس کا تعین ہر ملک کے اپنے اپنے حالات — آب و ہوا۔ نسلی خصوصیات۔ صحت عامہ۔ وغیرہ۔ کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ جس ملک میں، جس عمر میں لڑکا یا لڑکی سن بلوغت تک پہنچتے ہوں اس ملک میں وہی عمر نکاح کی عمر ہوگی۔

مجرب دوا برائے۔ دمہ درد گردہ و پتھری۔
ملنے کا پتہ:۔
حاجی محمد دین۔ شیخ آرٹس ویئرکر متصل گیٹش پیرا ملنیہ لارنس روڈ کراچی
نوٹ:۔ جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

اسلام میں جھوٹ بولنے کی اجازت

راست بازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں، قدامت پرست مذہبی طبقہ کے ایک نمائندہ کا مندرجہ بالا اقتباس درج کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں جن میں پوچھا گیا ہے کہ اس باب میں قرآن کریم کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اگر اس کی رو سے بعض حالات میں جھوٹ بولنے کی اجازت ہے یا جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے تو وہ کون سے حالات یا مواقع ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم اور دین کے بنیادی اصول سے متعلق ہے اس لئے اس پر غور و فکر کی اشد ضرورت ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ہم اسے سامنے لا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہی صاحب نے جن کا اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے، ایک دلیل قرآن کریم سے پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

اسلام میں توحید کے اقرار کی جیسی کچھ اہمیت ہے کسی جاننے والے سے پوشیدہ نہیں ۔ یہ حق پرستی کا اولین تقاضا ہے اور ہر مومن سے دین کا مطالبہ سب سے پہلا مطالبہ ہے ۔ نظری حیثیت سے دیکھا جائے تو اس معاملہ میں قطعاً کسی لچک کی گنجائش نہ ہونی چاہیئے۔ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ چاہے اس کے گلے پر چھری رکھ دی جائے اور خواہ اس کی بوٹیاں کاٹ ڈالی جائیں، وہ توحید کے اقرار و اعلان سے ہرگز نہ پھرے۔ لیکن قرآن ایسے حالات میں جب کہ ایک شخص کو ظالموں سے جان کا خطرہ لاحق ہو جائے یا اسے ناقابل برداشت

اذیت دی جائے۔ کلمۂ کفر کہہ کر بچ جانے کی اجازت دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دل میں عقیدۂ توحید پر قائم ہے۔ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (۱۶/۱۰۶) یہ چاہے عزیمت کا مقام نہ ہو مگر رخصت کا مقام ضرور ہے۔ اور یہ رخصت اللہ تعالیٰ نے خود عطا فرمائی ہے۔

۳۔ سورۃ النحل کی مذکورہ بالا پوری آیت یوں ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (۱۶/۱۰۶)

جو کوئی ایمان لانے کے بعد پھر اللہ سے منکر ہوا اور اس کا دل اس سے رضامند ہوگیا۔ تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے مگر ہاں جو کوئی کفر پر مجبور کیا جائے (اور بے بس ہو کر بخوفِ جان ایسی بات کہہ دے) اور اس کا دل اندر سے ایمان پر مطمئن ہو تو ایسے لوگوں سے مواخذہ نہیں)۔ (ترجمہ ابوالکلام آزاد مرحوم)

اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ کوئی شخص بہ حالتِ مجبوری (بخوفِ جان) زبان سے کفر کی بات کہہ دے حالانکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، تو اس سے اس کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ آئیے ہم دیکھیں کہ کن لوگوں نے اس "اجازت" سے فائدہ اٹھایا اور ان کا مقام کیا ہے۔

تاریخی شواہد

سب سے پہلے حضرات انبیائے کرام کو لیجئے۔ جن کا تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ انہیں سخت اذیتیں دی گئیں۔ حتیٰ کہ انہیں اپنی جان تک کا بھی خطرہ لاحق ہوگیا۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی اس رخصت سے فائدہ اٹھا کر زبان سے کلمۂ کفر نہ کہا۔ یہ تو تھے انبیاء۔

۲۔ ان کے متبعین میں سے بھی کسی کے متعلق قرآن میں نہیں کہ انہوں نے اذیت سے بچنے یا جان بچانے کی خاطر زبان سے کفر کا اقرار کر لیا ہو۔ اس کے برعکس (مثلاً) ساحرین دربارِ فرعون کو دیکھئے۔ وہ ایمان لائے تو فرعون نے اپنے پورے جلالِ شاہی کے ساتھ گرج کر کہا کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا دوں گا۔ تمہیں سولی پر چڑھا دوں گا۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرا عذاب کس قدر سخت ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے دل کے پورے سکون کے ساتھ کہہ دیا کہ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (۲۰/۷۲) جو تیرے جی میں آئے فیصلہ کرلے۔ ہم ایمان لے آئے۔ یہ ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہے۔

صحابہؓ کی زندگی

خود نبی اکرمؐ پر ایمان لانے والوں کی ابتدائی (مکی) زندگی کو سامنے لائیے۔ وہ کون سا ظلم تھا جو ان پر نہیں توڑا گیا۔ وہ کون سی اذیت تھی جو انہیں پہنچائی گئی۔ ایسے مظالم اور اذیتیں کہ جن کے تذکرہ سے روح کپکپا اٹھتی ہے۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض یہ اذیتیں اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہو گئے لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی ایسا نہ کیا کہ کفر کا کلمہ زبان پر لاکر ان اذیتوں سے بچ جاتا۔ یا اپنی جان بچا لیتا۔ ان کی یہی صداقت شعاری اور حق گوئی میں استقامت تھی جو دین کے استحکام کا موجب بنی اور جسے دنیا کے سامنے فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ (اور پیش کیا جاتا ہے) تاریخ انسانیت پر غور کیجئے اس میں انہی لوگوں کا نام ستاروں کی طرح روشن ہے جنہوں نے حق کی خاطر جان دے دی لیکن اپنے دعوے سے جھوٹ موٹ بھی انکار نہ کیا۔ دنیا میں خود حق و صداقت کا نام انہی کی قربانیوں سے روشن ہے۔ اور یہی مثالیں ہیں جن سے ہر مدعی حق و صداقت ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ تکالیف سے ڈر کر، یا جان بچانے کی خاطر زبان سے کلمۂ کفر کہہ دینا کسی بلند کیریکٹر کا ثبوت نہیں دیتا۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن نے اس باب میں جو اجازت دی ہے تو اس سے مراد کیا ہے؟

اس اجازت سے مراد

سو یہ واضح ہے کہ معاشرہ میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی بہت باہمت کوئی میانہ رو۔ کوئی بڑے کمزور۔ ایک جامع ضابطۂ ہدایت کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان سب کی نفسیات کو سامنے رکھ کر راہ نمائی دے۔ قرآن کی یہ اجازت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اذیتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کی ہمت نہ رکھیں۔ اور جان دے دینے کا عزم اپنے اندر نہ پائیں۔ یہ نہیں کہ (جیسا کہ اقتباس میں کہا گیا ہے) نظری طور پر تو قرآن نے حق و صداقت کی خاطر جان دے دینے کی تعلیم دی ہے اور عملی طور پر اس کی اجازت دیدی ہے کہ مجبوری کے وقت بیشک جھوٹ بول کر جان بچا لی جائے۔ قرآن کی تعلیم سے یہ نتیجہ اخذ کرنا اور اس سے یہ کلیہ وضع کر لینا کہ عملی زندگی کی بعض ضروریات کی خاطر جھوٹ بولنا جائز ہے دین کے خلاف بڑی زیادتی ہے۔ قرآنی تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ سردست اس قدر باہمت ہیں کہ وہ مصائب اور تکلیف کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کر سکیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے اندر اتنی پختگی کردار پیدا کریں کہ وہ حق کی خاطر جان تک دے دینے کے لئے ہر وقت تیار رہیں نہ یہ کہ وہ اسے معمول زندگی ہی سمجھ لیں کہ مجبوری کے وقت جھوٹ بولنا جائز ہے۔

۴۔ اس سلسلہ میں انہوں نے دو ایک روایات بھی نقل کی ہیں جنہیں وہ بزعم خویش صحیح سمجھتے ہیں مثلاً:-

روایات سے تائید

اسما بنت یزید۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ جھوٹ جائز نہیں ہے مگر تین چیزوں میں۔ مرد کی بات عورت سے تاکہ وہ اس کو راضی کرے۔ جنگ اور اصلاح بین الناس۔

بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ (اور اس قسم کی اور روایات) وضعی ہیں اور لوگوں نے اپنے جھوٹ کے جواز کے لئے انہیں گھڑ لیا تھا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے قرآن کریم نے کہیں اس کی تعلیم نہیں دی کہ تم جھوٹ بول کر اصلاح بین الناس (یا میاں بیوی کے تعلقات کی خوشگواری) کی کوشش کیا کرو۔ سورۂ نحل کی جو آیت پہلے درج کی گئی ہے اس سے بھی اس قسم کی اجازت نہیں نکلتی۔

عملاً دیکھئے تو جو اصلاح جھوٹ بول کر کرائی جائے۔ وہ کتنے دنوں تک قائم رہ سکتی ہے؟ جوں ہی وہ جھوٹ بکھر کر سامنے آئے گا، اصلاح ختم ہو جائے گی۔ بلکہ معاملہ پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو جائے گا ــــ ہمیں ایک طرف یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک شخص مٹھی بند کئے اپنے گھوڑے کے آگے آگے چل رہا تھا تاکہ گھوڑا یہ سمجھ کر اس کی مٹھی میں کھانے کی کوئی چیز ہے اس کے پیچھے پیچھے چلتا جائے۔ جب معلوم ہوا کہ اس شخص کی مٹھی خالی تھی تو اس کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ اس کی شہادت کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔ حالانکہ گھوڑے کو سیدھے راستے پر چلانے کے لئے یہ عملی جھوٹ بول رہا تھا ــــ اور دوسری طرف یہ کیا جاتا ہے کہ لوگوں میں صلح کرانے اور میاں بیوی کے تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لئے جھوٹ بولنے کی اجازت دی گئی ہے۔

باقی رہا "جنگ میں جھوٹ بولنا"۔ تو جنگ کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ دشمن کو علی الاعلان کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم تمہیں ہر ممکن طریق سے گرفتار کر لیں گے یا قتل کر دیں گے اس اعلان کے بعد وہ فریق مقابل کے حربوں سے بچنے کی تدابیر بھی سوچتا ہے۔ اور اسے گرفتار یا قتل کرنے کے اقدامات بھی کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو تدبیر بھی اختیار کی جائے گی جائز ہوگی ہاں اگر آپ اس کا اعلان نہ کریں اور دوستی کے پردے میں جھوٹ بول کر کسی کو قتل کر دیں تو یہ بہت بڑا جرم ہوگا۔

کعب بن اشرف کا قتل

۵۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے۔

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں۔ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔

وضعی روایات کی یہ ایک ایسی بین مثال ہے جسے دیکھ کر انسان کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ کعب بن اشرف ایک یہودی شاعر تھا جو مدینہ میں رہتا تھا اسے اسلام سے سخت عداوت تھی اور وہ اپنے اشعار سے

لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کیا کرتا تھا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ خود نبی اکرمؐ کی ہجو میں اشعار کہتا تھا۔ اس سلسلہ میں کیا کیا گیا۔ اسے بخاریؒ کی روایت کے الفاظ میں سنئے۔

عمرو بن دینارؒ کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبداللہؓ سے سنا۔ وہ کہتے تھے رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ کعب بن اشرف کے قتل کا کون ذمہ لیتا ہے۔ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو بڑی ایذا دی ہے۔ محمد بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ کیا آپ کو پسند ہے کہ میں اسے مار ڈالوں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔

محمد بن مسلمہ نے کہا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں کچھ بات بناؤں۔ آپ نے فرمایا تجھے اختیار ہے۔ محمد بن مسلمہ اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اس شخص (یعنی محمدؐ نے) ہم سے صدقہ مانگا ہے۔ اور ہمیں ستا رکھا ہے۔ میں تجھ سے کچھ قرض لینے آیا ہوں۔ کعب بن اشرف بولا (ابھی کیا ہے) ابھی تو تم اس سے رنج اٹھاؤ گے۔ محمد بن مسلمہ نے کہا۔ خیر اب اس کا اتباع کر لیا۔ ابھی ہم اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ جب تک ہم نہ دیکھ لیں کہ آگے اس کا کیا رنگ ڈھنگ ہے۔ بھائی! میں تیرے پاس قرض لینے آیا ہوں۔

اس کے بعد روایت میں ہے کہ معاملہ اس پر طے ہوا کہ محمد بن مسلمہ، کعب کے پاس اپنے ہتھیار رہن رکھ دیں گے اور وہ انہیں قرض دیدے گا۔ اس مقصد کے لئے دوسرے وقت پر ملنے کا وعدہ ہوا۔ رات کے وقت محمد بن مسلمہ کعب کے دودھ شریک بھائی ابو نائلہ کو ساتھ لے کر کعب کے پاس گئے اور اسے باتوں میں لگا کر اس کے مکان سے باہر لے آئے اور اس طرح اسے دھوکے سے قتل کر دیا۔

اور رسولِ خداؐ کو اس کے مارنے کی خوشخبری سنائی۔

(بخاریؒ۔ کتاب المغازی)

ذرا غور کرنے سے نظر آجائے گا کہ یہ روایت کس قدر وضعی ہے۔ مثلاً (ا) کسی کو اس طرح دھوکے سے قتل کرنا عربوں کے قومی شعار کے خلاف تھا۔ چہ جائیکہ نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے صحابہؓ اس روش کو اختیار کرتے۔

(ب) عربوں کی سچ بولنے کی کیفیت یہ تھی کہ جب قیصر نے اپنے دربار میں ابوسفیان سے نبی اکرمؐ کے حالاتِ زندگی دریافت کئے تو اس وقت ایسا موقع تھا کہ اگر قیصر کو خدا اور مسلمانوں کے خلاف ورغلا دیا جاتا تو اہل مکہ کا بہت بڑا مقصد حاصل ہو جاتا۔ لیکن ابوسفیان نے یہ سب کچھ جاننے بوجھنے کے باوجود، جھوٹ کا ایک لفظ

بھی زبان سے نہ نکالا اور ساری باتیں سچ سچ کہدیں۔ ظاہر ہے کہ جن عربوں کی جاہلیہ میں یہ حالت تھی، کیا وہ اسلام لانے کے بعد، اس قدر کھلی ہوئی جھوٹ کی روش پر اتر آئیں گے؟ اور پھر کیا جس ذات اقدس و اعظم کے متعلق، ابوسفیان جیسا سخت دشمن حضور کی عدم موجودگی میں قیصر سے کہتا ہے کہ آپ نے ساری عمر نہ جھوٹ بولا ہے، نہ کسی کو دھوکا دیا ہے، وہ اپنے صحابہؓ کو جھوٹ بولنے کی اجازت دیں گے؟

(ج) یہ جنگ کی حالت بھی نہیں تھی۔

(د) یوں بھی، کعب بن اشرف کے جرائم کیسے ہی سنگین کیوں نہ ہوں، اگر اس زمانے میں اسلامی عدالت قائم ہو چکی تھی، تو اسے عدالت کی طرف سے قتل کی سزا مل سکتی تھی۔ مگر باقاعدہ عدالت قائم نہیں ہوئی تھی۔ تو عربوں کے جس قبائلی طریق کے مطابق جرائم کی سزا کا فیصلہ ہوتا تھا۔ وہی طریق اس صورت میں بھی اختیار کیا جاتا۔

(س) سب سے بڑی چیز یہ کہ قرآن کریم کسی کو اس طرح قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے یہ باور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ نبی اکرمؐ کعب کے قتل کے لئے اس طریق کو پسند فرماتے اور اس طرح کے جھوٹ کی اجازت دیتے۔ اس میں مجبوری کا بھی کوئی سوال نہیں جس کا ذکر سورۂ نحل کی آیت میں (جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے) آیا ہے۔ اس میں جان بچانے کی خاطر کلمۂ کفر کو زبان پر لے آنے کی اجازت ہے۔ کسی کی جان لینے کے لئے جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔

(۶) اس سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ (مثلاً)

دروغ مصلحت آمیز اگر (جنگ میں) کوئی سپاہی دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو جائے اور دشمن اس سے اسلامی فوج کے راز معلوم کرنا چاہے تو ان کا بتانا گناہ اور دشمن کو جھوٹی اطلاع دے کر اپنی فوج کو بچانا واجب ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ظالم کسی بے گناہ کے قتل کے درپے ہو اور وہ غریب کہیں چھپا ہوا ہو تو سچ بول کر اس کے چھپنے کی جگہ بتا دینا گناہ اور جھوٹ بول کر اس کی جان بچا لینا واجب ہے۔

یہ دونوں مثالیں سورۂ نحل کی اس آیت کے مفہوم کے تابع آجاتی ہیں جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی جان بچانے کی خاطر جھوٹ بولنے کی اجازت۔ یہاں اپنی جان بچانے کا ذکر ہے۔ ان مثالوں میں دوسرے بے گناہوں کی جان بچانے کا سوال درپیش ہے۔ جنگ کی صورت میں ہزارہا بے گناہوں کی جان، اور مظلوم کی صورت میں ایک بے گناہ کی جان بچانے کا سوال۔ اگرچہ ایسے مواقع پر بھی اگر وہ شخص جھوٹ بولنے کی بجائے اپنی

جان دیدیتا ہے اور راز نہیں بتاتا، تو اس کا یہ عمل رخصت کی بجائے عزیمت کا آئینہ دار ہوگا۔

یہاں تک تو بات صاف ہے۔ لیکن اعتراض وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں ان مثالوں کے بعد کلیہ یہ بتایا جاتا ہے کہ

غلط کلیہ ہر اچھا مقصد جس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن ہو اس کے لئے جھوٹ بولنا حرام ہے۔ لیکن اگر اس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن نہ ہو تو جھوٹ جائز ہے۔ پھر اگر وہ مقصد ایسا ہو کہ اس کا حاصل کرنا مباح ہو تو اس کے لئے جھوٹ بھی مباح ہے۔ اور اگر اس کا حصول واجب ہو تو اس کے لئے جھوٹ بھی واجب ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کلیہ انسان کو اتنا بڑا وسیع میدان مہیا کر دیتا ہے جس میں اسے جھوٹ بولنے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ جس کا جی چاہے اپنے مقصد پیش نظر کو "اچھا مقصد" قرار دے کر اس کے حصول کے لئے بغیر کسی جھجک کے جھوٹ سے کام لے لے۔ اسی لئے سینٹ پال نے کہا تھا کہ

> اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر مجھ پر گنہگار کی طرح کیوں حکم دیا جاتا ہے۔ (رومیوں کے نام)۔ ۳:۷)

لیکن یہ سینٹ پال کا مذہب ہے (بشرطیکہ یہ روایت صحیح ہے)۔ اس نبی صادقؐ کی تعلیم نہیں جو دنیا سے جھوٹ مٹانے اور حق و صداقت کا علم بلند کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کی تعلیم کی رو سے، صرف کمزور دل انسانوں کو اس کی اجازت ہے کہ اگر وہ اذیتیں برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، تو جھوٹ بات بنا کر اپنی جان بچالیں۔ یہ نہیں کہ انسان ہر "اچھے مقصد" کے حصول کے لئے جھوٹ کو جائز سمجھ لے اور اپنا شیوہ بنا لے۔

دین کے اُصولوں میں لچک

(ایک اہم سوال)

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دیکر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔

——— لیکن

جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپؐ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش۔ امام قریش میں سے ہوں گے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیے کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

یہ تھا اقتباس جسے ہم نے اشاعت سابق میں درج کیا تھا۔ اس پر ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

..... آپ کے الائمۃ من قریش سے متعلق سوال پر بھی اعتراض کیا ہے۔ یہ رسول اللہؐ کی حدیث ہے۔ آپ تو حدیث کے منکر ہیں اس لئے بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ لیکن ..... صاحب چونکہ حدیث کے منکر نہیں اس لئے وہ مجبور

ہیں کہ اس حدیث سے جو نتیجہ نکلتا ہے۔ اسے صحیح تسلیم کریں۔ اور اس کے مطابق عمل بھی کریں۔ اس سے اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکلتا ہے کہ حضورؐ نے جو اصول مساوات پیش فرمایا تھا ملکت کی فرمان روائی کے سلسلے میں اسے ترک کرکے دوسرا حکم دیا۔

یہ ٹھیک ہے اگر کوئی شخص ان تمام احادیث کو جو موجودہ مجموعوں میں درج ہیں۔ یا کم از کم صحاح ستہ میں درج ہیں۔ یا صحیحین میں، یا بخاری میں درج ہیں حرفاً حرفاً صحیح مانتا ہو اور ان پر کسی قسم کی تنقید کو جائز نہ سمجھتا ہو اس کے متعلق کہا جا سکے گا کہ وہ (اپنے اس عقیدہ کے ہاتھوں) مجبور ہے کہ وہ اس روایت (الائمۃ من قریش) کو صحیح مانے اور اس سے جو نتیجہ نکلتا ہو اسے قبول کرے۔ اس سے ہم اور ہیں سے گفتگو کریں گے۔ اور اسے بتائیں گے کہ اس کا یہ عقیدہ صحیح نہیں — لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان صاحب کا جن کا اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے احادیث کے متعلق یہی عقیدہ ہے اور وہ بھی اس حدیث کو صحیح ماننے کے لئے مجبور ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بات یہ نہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ

یہ تو مجبور نہیں

کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔

(رسائل و مسائل ص ۲۹۰)

حتیٰ کہ

یہ دعویٰ کرنا بھی صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی حدیثیں درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ یہ صاحب اس حدیث کو اس لئے صحیح ماننے پر مجبور نہیں تھے کہ یہ احادیث کے مجموعوں میں درج ہے۔ اور اسے سند کے اعتبار سے صحیح مانا جاتا ہے۔

حدیث کی صحت کا معیار

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے جو اس حدیث کو صحیح مان کر اس سے ایسا نتیجہ نکالا۔ تو ان کے پاس اس کے صحیح ہونے کی دلیل کیا تھی؟ وہ بھی سن لیجئے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ الفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسولؐ

کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات کو پرکھ لیتی ہے ...... اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے۔ اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذات نبویؐ کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے ..... وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ اس میں سے کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکارؐ کا ہو سکتا ہے۔ اور کون سی چیز سنت نبویؐ سے اقرب ہے (تفہیمات حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۴)

یعنی انھوں نے اس حدیث کو اس لئے صحیح سمجھا ہے کہ ان کے نزدیک یہ بات کہ انسان، قرآن کے جن اصولوں کو عمر بھر پیش کرتا ہے، جب عملی ضرورت کا تقاضا ہو تو انہیں الگ پھینک دے۔ اسلام کے مزاج کے عین مطابق اور (معاذ اللہ) سنت نبویؐ کے عین موافق ہے۔ اس لئے ان کی بصیرت انہیں بتا رہی ہے کہ یہ ضرور نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہو گی کہ

(ا) یہ صاحب اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے اس لئے مجبور نہیں تھے کہ یہ اس حدیث کو صحیح ماننے پر مجبور تھے بلکہ۔

(ب) یہ اس حدیث کو اس لئے صحیح مانتے ہیں کہ جو اصول اس سے مستنبط ہو جاتا ہے وہ ان کے نزدیک اسلام کی تعلیم کے عین مطابق اور مزاج نبویؐ سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ ان کی نگہ بصیرت نے انہیں بتایا ہے کہ اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ وعظ و نصیحت کے لئے بڑے بڑے بلند آہنگ اصول بیان کرو۔ لیکن جب عمل کا وقت آئے تو انھیں بالائے طاق رکھ کر دھڑلے سے ان کے خلاف چلو۔ اور اسی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے (عیاذاً باللہ) نبی اکرمؐ نے یہ کیا کہ عمر بھر قرآن کے اس اصول کی تلقین فرماتے رہے کہ سب انسان

حضورؐ کا اعلان

انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں۔ اور عزت و منصب کا معیار تقویٰ ہے۔ حتیٰ کہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں بھی یہ اعلان فرمایا کہ

اے نوعِ انسان! سن رکھو کہ تمہارا سب کا رب ایک ہے اور تم ایک ہی اصل کی شاخیں

ہو۔ اس لئے عربی کو عجمی پر۔ اور عجمی کو عربی پر۔ سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں بجز تقویٰ کے۔

لیکن آخر میں یہ وصیت فرمادی کہ سلطنت میرے قبیلے کے لوگوں کے اندر ہی رہے گی۔ کوئی غیر قریشی خلیفہ نہیں ہو سکے گا۔

واضح رہے کہ ہم بھی ایسا کہنے میں ان صاحب کے ہم زبان ہیں کہ احادیث کے مجموعوں میں جس قدر روایات درج ہیں، وہ سب کی سب صحیح نہیں۔ لیکن اس کے بعد ہمارا اور ان کا راستہ الگ الگ ہو جاتا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ احادیث کو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھ لینا چاہیئے۔ جو اس کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھ لینا چاہیئے، جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کر دینا چاہیئے۔ لیکن ان صاحب کا ارشاد ہے کہ حدیثوں کے پرکھنے کا معیار ہماری ناقص بصیرت ہے۔ جسے ہم صحیح قرار دے دیں وہ صحیح تسلیم کی جائے گی جسے ہم ضعیف کہہ دیں وہ ضعیف قرار پائے گی۔

ہمارا معیار

ہم اس حدیث (الائمۃ من قریش) کو اس لئے صحیح نہیں تسلیم کرتے کہ یہ

(ا) قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

(ب) نبی اکرمؐ کا کوئی ارشاد یا عمل قرآن کے خلاف نہیں تھا۔ اور

(ج) یہ بات حضورؐ کے بلند ترین کردار کے منافی تھی کہ تقویٰ کے معیار کو چھوڑ کر سلطنت کو اپنے خاندان میں محصور فرما دیتے۔ حضورؐ اسی "قیصری اور کسروی بت" کو توڑنے کیلئے آئے تھے۔

اور جب یہ حدیث ہی صحیح نہیں تو یہ مسلک کہ، انسان عمر بھر جن قرآنی اصولوں کا پرچار کرتا چلا آرہا ہو، عملی وقت آنے پر انہیں سانپ کی کینچلی کی طرح اتار پھینک دے اور ان کے خلاف دوسرا راستہ اختیار کرلے اسلام کے یکسر خلاف ہے۔ اور اسے حضورؐ کی طرف منسوب کرنا بارگاہِ رسالتؐ میں سخت گستاخی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم یا سنّت نبوی کو اپنی بصیرت کے قالب میں ڈھالنا بہت بڑی جسارت ہے۔ ہماری بصیرت کو اسلام کے تابع چلنا چاہیئے نہ کہ اسلام کو ہماری بصیرت کے تابع۔

عائلی قوانین پر اعتراضات

پارلیمان کی اسٹینڈنگ کمیٹی نے، مولانا عباس علی صاحب کابل بابت تنسیخ عائلی قوانین مسترد کر دیا۔ تو اس کے بعد مولانا مفتی محمود صاحب نے، جو اس کمیٹی کے ایک رکن ہیں۔ راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس میں فرمایا کہ "عائلی قوانین کی ہر شق مداخلت فی الدین" اور اسلام کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حسب ذیل خصوصی اعتراضات وارد کئے۔

نکاح کا سرکاری رجسٹر میں درج کرانا ایک مفید چیز ہے۔ لیکن یہ اسلام کی روح کے منافی ہے۔ کیونکہ اسلام اس قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ (پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

سوال یہ ہے کہ اگر اسلام میں نکاح کو درج رجسٹر کرانے کی ممانعت نہیں، اور یہ ایک مفید تجویز ہے، تو اسے اختیار کر لینے میں کیا حرج ہے جو اس کی اس طرح مخالفت کی جا رہی ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض ملاحظہ فرمائیے۔

اگر نکاح کو درج رجسٹر نہ کرایا جائے تو خاوند، بیوی کے ترکہ سے اور بیوی خاوند کے ترکہ سے اپنے حصے کا بطور حق مطالبہ نہیں کر سکتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ یا تو محترم مفتی صاحب نے عائلی قوانین کا مطالعہ ہی نہیں فرمایا اور اگر وہ ان قوانین کو جانتے اور سمجھتے ہیں تو وہ اس اعتراض سے عوام میں سخت غلط فہمی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ عائلی قوانین میں نکاح کو رجسٹر میں درج نہ کرانا جرم قرار دیا گیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ جو نکاح اس رجسٹر میں درج نہیں کرایا جائے گا، اسے نکاح تسلیم ہی نہیں کیا جائے گا۔ نکاح کو درج رجسٹر کرایا جائے یا نہ کرایا جائے۔ یہ جوڑا نکاح کے بعد میاں بیوی تسلیم کیا جائے گا اور انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو ایک منکوحہ جوڑے کو حاصل ہوتے ہیں۔

۳۔ یہی صورت ایک اور اعتراض کی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ

اگر نکاح کو درجِ رجسٹر نہ کرایا جائے اور اس شخص کی بیوی اغوا کر لی جائے تو وہ اس کے خلاف عدالت میں دعوے دائر نہیں کر سکتا۔

یہ بھی غلط ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ نکاح کو درجِ رجسٹر نہ کرانے سے، ان کے میاں بیوی ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بیوی کے اغوا کی صورت میں قانون جو حق خاوند کو دیتا ہے وہ بدستور قائم رہتا ہے خواہ نکاح درجِ رجسٹر ہو یا نہ ہو۔

۴۔ طلاق کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ طلاق تین قسطوں میں (وقفوں کے ساتھ) دی جائے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ان میاں بیوی کو باہمی موافقت کے لئے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ لیکن یہ یکسر غیر اسلامی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان قوانین میں یہ کہا ہی نہیں گیا کہ طلاق تین قسطوں (یا وقفوں) میں دی جائے۔ ان قوانین کی رو سے، ایک ہی مرتبہ کی طلاق، طلاق ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ طلاق موثر ہوتی ہے تین ماہ کی مدت کے بعد۔ (ان قوانین کی یہ شق بڑی ہی ناقص ہے۔ جس کے متعلق ہم تفصیل سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ لیکن یہ اور سوال ہے۔ اس وقت ہم صرف مفتی صاحب کے اعتراض سے بحث کر رہے ہیں)

آپ ذرا اس نکتہ پر غور کیجئے۔ طلاق کا ایک طریقہ ایسا ہے جس میں میاں بیوی کو اس کا موقع ملتا ہے کہ وہ باہمی موافقت کر لیں۔ دوسرا طریقہ ایسا ہے جس میں ایسا موقع نہیں ملتا۔ آپ کسی سے پوچھئے وہ کہہ دے گا کہ اول الذکر طریق ثانی الذکر کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں باہمی مصالحت اور موافقت کی گنجائش رہتی ہے۔ لیکن مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ طریق یکسر غیر اسلامی ہے۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ یہ طریق غیر اسلامی کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ اہل حدیث کے ہاں رائج ہے اور مفتی صاحب حنفی ہیں جن کے ہاں دوسرا طریق رائج ہے۔

اب ذرا اس ملک کی مشکلات دیکھئے۔ فرض کیجئے کہ موجودہ قانون منسوخ کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ کوئی اور قانون وضع کیا جاتا ہے۔ اگر وہ قانون، اس طریق کے مطابق ہوگا جو اہلِ حدیث کے ہاں رائج ہے تو اسے حنفی حضرات "غیر اسلامی" قرار دیں گے۔ اور اگر وہ اس طریق کے مطابق ہوگا جو حنفیوں کے ہاں رائج ہے تو اسے اہلِ حدیث "غیر اسلامی" ٹھہرائیں گے۔

یہ ہے قانون سازی کے سلسلے میں وہ بنیادی مشکل جس کی طرف ہم ملک کے سمجھنے سوچنے والے طبقہ کی توجہ بار بار منعطف کرا رہے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں کہ وہ اس اصولی مسئلہ کا فوری حل تلاش کریں تاکہ قوانین مرتب اور نافذ ہونے کے بعد، ملک اس قسم کی مذہبی خانہ جنگی کا شکار نہ ہو جائے۔

۵۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا۔

ان قوانین میں لڑکے اور لڑکی کے نکاح کے لئے جو کم از کم عمر رکھی گئی ہے وہ بھی اسلام کے خلاف ہے۔ لڑکی کے بالغ ہونے کی کم از کم عمر نو سال اور لڑکے کی بارہ سال ہے۔

(روزنامہ جنگ۔ راولپنڈی ۔ $\frac{10}{62}$ .5)

کسی ملک میں، لڑکا یا لڑکی بالعموم کس عمر میں بالغ ہوتے ہیں اس کا فیصلہ ڈاکٹر کر سکتے ہیں۔ (واضح رہے کہ سن بلوغت کے ساتھ سن رشد کا دیکھنا بھی ضروری ہوگا۔ یعنی وہ عمر جس میں بچے شعور تک پہنچ جائیں۔) معلوم نہیں کہ محترم مفتی صاحب کے پاس اس امر کی سند (اتھارٹی) کیا ہے کہ ہمارے ملک میں لڑکی اور لڑکا علی التواتر نو اور بارہ سال کے عمر میں یہ شرائط پوری کر لیتے ہیں۔

۶۔ اس کے بعد مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ۔

(۱) نابالغ کا نکاح جائز ہے۔

(۲) (یتیم) پوتا اپنے دادا کی املاک کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اور

غور سے سنئے (۳) چار منکوحہ بیویوں کے علاوہ زرخرید باندیوں کو بغیر نکاح کے بیوی بنانا جائز ہے۔ (ایضاً)

زرخرید باندیوں کو بغیر نکاح بیوی بنا لینا ——— یہ ہے وہ اسلام جو اس سب سے بڑی اسلامی مملکت کی طرف سے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا تاکہ غیر مسلم کھنچ کر اس کی طرف آئیں اور حق کا بول بالا ہو۔!

آہ بے چارہ اسلام!

استفسارات

محترمی و مکرمی!

السلام علیکم۔ چند ایک نکات پر آپ سے رہنمائی چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے لئے تھوڑا بہت وقت نکال سکیں گے۔

۱۔ اسلامی معاشی نظام میں ایک لامحدود ذاتی ملکیت کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر ایک شخص کے پاس ایک دفعہ کسی طرح سے سرمایہ آجائے تو پھر وہ سرمایہ عموماً بڑھتا ہی رہتا ہے۔ بیشتر حالات میں نفع اور نقصان کے بعد حساب کرنے پر نفع کا پلڑا عموماً بھاری ہی رہتا ہے اور پھر نتیجۃً سرمایہ اپنی اصل مقدار سے دگنا، سگنا اور کئی ہزار گنا تک ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(i) کیا سرمایہ میں یہ زیادتی محض اس سرمایہ اور محنت کا بدلہ ہے جو شروع میں لگایا جاتا ہے۔

(ii) یا محض اس دیکھ بھال (SUPERVISION) کا انعام ہے جو ایک بڑا سرمایہ دار اپنے بند کمرے میں بیٹھ کر ٹیلیفون اور ریڈیو کے ذریعہ کرتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آخر سرمایہ دار نے بھی تو اپنے جسم و ذہن سے محنت کی ہے۔ اس کا بدلہ اسے بھی ملنا چاہیئے لیکن تب بھی یہ چیز سامنے آتی ہے کہ آیا ایک شخص کی ذہنی و جسمانی محنت کی قیمت دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں اسلئے کئی گنا ہو گئی کہ اس کے پاس سرمایہ ہے۔ مثلاً ایک سرمایہ دار کے پاس دس لاکھ روپے کا کاروبار ہے اگر آپ اُسے ایک ماہ میں صرف ایک فیصدی منافع لینے کی اجازت دیں تب بھی اسے دس ہزار روپے ماہوار بچے گا۔ جو آپ کے ایک بہترین معاشی نظام میں کم از کم دس آدمیوں کی آمدنی کے برابر ہو گا۔ صاف ظاہر ہے کہ سرمایہ دار کو جس چیز نے مالی طور پر دس آدمیوں کے برابر بنایا ہے وہ صرف لامحدود (یا بنسبت زیادہ) سرمایہ ہے۔ بڑے سرمایہ داروں کی حدِ منافع بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس لامحدود ملکیت کے تصور نے معاشی توازن کو کتنا بگاڑ دیا ہے۔

لیکن اگر اس کے مقابلہ میں بڑی صنعتوں کو تمام لوگوں کے اجتماعی کنٹرول (حکومت) میں دے دیا جائے اور چھوٹے پیمانے پر عام آدمی کو کاروبار کرنے کی اجازت ملے تو سرمایہ دار اور مزدور کی آمدنی کا فرق معقول حد تک گھٹ جائے گا۔

۲- ایک شخص نے محنت کی اور اسے اس کا بدلہ مل گیا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک انسان کو محض کروڑوں روپے اس لئے مل جائیں کہ وہ ایک کروڑپتی کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں ایک انسان کو ہوش آتے ہی سب سے بڑی فکر اپنی روٹی کی ہو تو کیا محض اس لئے کہ اس کا باپ ایک غریب انسان تھا کسی امیر یا غریب کے گھر پیدا ہونا کوئی اختیاری فعل تو ہے نہیں کہ جس کے سلسلے میں کوئی انعام یا سزا دی جا سکے۔ اسلام کا وراثت کا قانون بھی اس مسئلہ کا مکمل حل نہیں۔ یہ درست ہے کہ قانونِ وراثت سے جائداد کئی حصوں میں بٹ جائے گی۔ لیکن ایک بڑی جائداد کے اگر دو چار حصے ہو بھی جائیں اور پھر یہ علیحدہ علیحدہ کاروبار میں لگ کر منافع کمانا شروع کر دیں ـــ اور جس منافع میں سرمایہ کے مقابلہ میں محنت کا حصہ بعض اوقات تقریباً نظر انداز کر دینے کے قابل ہو جاتا ہے ـــ تو تھوڑے ہی عرصے بعد اصل جائداد سے کئی گنا بڑی جائداد پھر بن جائے گی۔

صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو مگر وہ اعتراض بہرحال وہیں ہے کہ ایک شخص کو ورثہ میں دس لاکھ روپیہ ملے۔ اور دوسرے کو دس روپے۔ محض اس بنا پر کہ ایک کے باپ کی چالیس لاکھ کی جائداد تھی اور دوسرے کی صرف چالیس روپے کی۔ ورثہ میں مقدار کے فرق کے علاوہ سوال یہ ہے کہ آخر ایک انسان کو کس حق کی بنا پر کچھ دیا جائے۔ محنت اس نے نہیں کی تو آخر بدلہ کس چیز کا۔؟

۳- اس چیز کے نتیجہ میں جو چیز ظہور پذیر ہو گی وہ اس اصول کو ہی ختم کر دے گی کہ ہر شخص کو زندگی کی دوڑ میں مساوی مواقع ملنے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ پہلا شخص تو آسانی سے اپنا کام شروع کر سکے گا۔ لیکن دوسرے کو سوائے مصائب و مشکلات کے اور کوئی چیز نظر نہیں آئے گی۔ کیا اسلام کوئی ایسا متوازی نظام پیش کرتا ہے جس میں اس چیز کا ازالہ کیا گیا ہو؟ اور ہر شخص کو بنیادی طور پر زندگی کی دوڑ میں ہر طرح کے مساوی مواقع ملیں ـــــــ

ـــــــ اور اگر نہیں تو کیوں نہ ہر شخص کو ورثہ میں ملنے والی جائداد کو اتنا گھٹا یا بڑھا یا جائے کہ ایک متوازن صورتِ حال پیدا ہو جائے۔ ضرورت سے زیادہ ورثہ کو "جنرل کنٹرول" میں دے دیا جائے۔ اور اگر ورثہ ضرورت سے کم ہو تو جنرل کنٹرول سے ہی پورا کر لیا جائے۔

میرے ذہن میں یہ چند اشکالات ہیں ـــ جن کا حل مقصود ہے۔ کوئی بحث کھڑی کرنا مقصد نہیں۔

والسلام

جواب

قرآن کریم جس معاشی نظام کا تصور پیش کرتا ہے اس میں یہ مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ اس نظام کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک چیز ہے سرمایہ اور دوسری چیز ہے محنت۔ قرآن کریم کی رو سے معاوضہ صرف محنت کا مل سکتا ہے (لیس للانسان الا ما سعیٰ ۵۳/۳۹) جو نفع محض سرمایہ پر حاصل ہو اسے ربوٰ کہا جاتا ہے اور ربوٰ قرآن کریم کی رو سے حرام ہے۔ ایسا حرام کہ اسے "خدا اور رسولؐ کے خلاف اعلانِ جنگ" سے تعبیر کیا گیا ہے (۲/۲۷۹) تجارت ہو یا صنعت۔ زمینداری ہو یا جائداد اندوزی۔ جہاں اور جتنا منافع صرف سرمایہ پر حاصل ہو گا اس کا شمار ربوٰ میں ہو جائے گا۔

(۲) قرآنی نظام میں تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری معاشرہ (مملکت) کے سر پر ہوتی ہے (۱۱/۶) ظاہر ہے کہ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برا ہو سکتی ہے کہ وسائل پیداوار اس کے زیر اقتدار رہوں۔ جب شکل یہ ہو گی تو کسی کو جائدادیں بنانے اور دولت سمیٹ کر رکھنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اس لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ جو کچھ کسی کی ضروریات سے زائد ہے وہ نوع انسان کی عام پرورش کے لئے کھلا رہنا چاہیئے (۲/۲۱۹) اس کی رو سے دولت کے انبار جمع کرنا جہنم کا عذاب مول لینا ہے۔ (۹/۳۴-۳۵)۔

(۳) جب اس نظام میں جائدادیں کھڑی کرنے یا دولت کے انبار جمع کرنے کی اجازت (یا ضرورت) ہی نہیں ہو گی، تو وراثت میں اتنا کچھ چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ لہذا زندگی کے میدان میں ہر انسانی بچہ ایک ہی مقام سے دوڑ کی ابتدا کرے گا۔ اور چونکہ ہر ایک کے لئے سامانِ نشو ونما کا مہیا کرنا معاشرہ کے ذمہ ہو گا۔ اس لئے وہ راستے میں بھی کسی مقام پر اس لئے نہیں رک جائے گا کہ اسے آگے بڑھنے کا سامان میسر نہیں۔

(۴) لیکن قرآن دنیا میں مروج غلط نظام سے اپنے اس مثالیؔ نظام تک بتدریج لے جانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ سب سے پہلے تعلیم و تربیت سے انسانی قلب و دماغ کی اصلاح کرتا ہے اور اس کے دل میں اس یقین کو راسخ کرتا ہے کہ جو انسان زیادہ سے زیادہ محنت کر کے اپنی ضروریات سے زائد سامانِ زیست

ؔ قرآن کے معاشی نظام کی تفصیلات پرویز صاحب کی کتاب "نظامِ ربوبیت" میں ملیں گی۔

(دولت وغیرہ) کو دوسرے انسانوں کی ضروریات کے لئے دے دیتاہے، اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور وہ اس دنیا سے اگلی دنیا میں سرفرازی اور خوشگواری (جنت) کی زندگی بسر کرتاہے۔ یہ ایمان وہ بنیاد ہے جس پر اس نظام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ بتدریج موجودہ معاشی نظام کو اپنے نظام میں بدلتا چلا جاتاہے۔ اس کے لئے وہ کہیں حکم دیتاہے کہ دولت کی گردش اوپر کے طبقہ میں ہی نہیں ہوتی رہنی چاہیئے (۵۹/۷) اسے سارے معاشرہ میں یوں رواں دواں رہنا چاہیئے جس طرح انسانی جسم میں خون گردش کرتا ہے۔ کہیں وہ زمین کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے لے کر ذاتی املاک کو کم کئے جاتا ہے (۱۸/۴) دوسری طرف وہ صدقات وخیرات اور احسان وایثار کی ترغیب سے، بہ طیب خاطر دولت کو ضرورت مندوں کی طرف منتقل کرنے کی صورتیں پیدا کرتا ہے۔ وراثت کے احکام بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔ اس طریق سے وہ رفتہ رفتہ معاشرہ کو اپنے معیاری نظام کی طرف لے جاتاہے۔ اس نظام کے قیام کے بعد ان اقدامات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جب معاشرہ میں کوئی محتاج ہی نہیں رہے گا تو خیرات کسے دی جائے گی۔ جب کسی کی جائداد ہی نہیں ہوگی تو ورثہ میں کیا تقسیم ہوگا۔

(۵) رسول اللہ کی زندگی اس مثالی نظام کا بہترین نمونہ تھی۔ (حضورؐ کی حیاتِ طیبہ امت ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ۔ بہترین نمونہ ہے) رسول کرتا یہ ہے کہ معاشرہ کو بتدریج منتہی تک لے جاتا ہے اور اس منتہی کا نمونہ خود بن کر دکھاتا ہے۔ آپ، حضورؐ کی زندگی کو دیکھئے آپؐ نے تمام عمر ایک پائی بھی ضرورت سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھی۔ حتیٰ کہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے رہے (۵۹/۹) آپؐ نے ایک پیسہ کی جائداد نہیں کھڑی کی۔ وفات کے وقت گھر میں سات دینار تھے۔ جب تک انہیں منفعتِ عامہ کے لئے دے نہیں دیا' دنیا سے رخصت نہیں ہوئے۔ دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے ورثہ میں کچھ بھی نہ چھوڑا۔ جو استعمال کی چیزیں چھوڑیں ان کے متعلق بھی فرمادیا کہ وہ عام مسلمانوں کے لئے کھلی رہیں گی۔ ورثہ میں تقسیم نہیں ہونگی ۔۔ اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایک وسیع مملکت وجود میں آچکی تھی اور حضورؐ اس مملکت کے سربراہ تھے۔ قرآن کریم نے بعض احکام کے متعلق کہا ہے کہ وہ صرف حضورؐ کی ذات تک محدود تھے۔ دوسرے مسلمانوں کے لئے نہیں تھے ۔۔۔ مثلاً حضورؐ کی ازواج مطہرات کسی اور کے نکاح میں نہیں آسکتی تھیں۔ لیکن حضورؐ نے جو معاشی زندگی بسر فرمائی اس کے متعلق کہیں یہ نہیں آیا کہ وہ صرف حضورؐ تک محدود تھی۔ عام مسلمانوں کے لئے نہیں تھی۔ وہ زندگی قرآن کریم کے پیش کردہ معاشی نظام کا جیتا جاگتا عکس تھی۔ اور پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ جب یہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہوگا تو اس میں افرادِ معاشرہ کی یہی زندگی ہوگی۔

اور یہی وہ نظام ہے جو نوعِ انسان کو اس عذاب سے نجات دلا سکتا ہے جس میں وہ اس وقت بری طرح سے مبتلا ہے اور جس کے ذمہ دار یورپ کا قدیم غاصبانہ معاشی نظام اور روس کا جدید مستبدانہ نظام دونوں ہیں۔ بنیاد ان دونوں کی باطل پر ہے اور جو نظام بھی باطل کی بنیادوں پر اٹھے گا وہ انسانیت کے لئے کبھی تعمیری نتائج مرتب نہیں کر سکے گا۔ حق کی بنیادیں صرف وحیٔ خداوندی مہیا کر سکتی ہے۔ اور وحیٔ خداوندی نہ یورپ اور امریکہ کے ہاں ہے نہ روس کے۔ یہ صرف قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

معاشی مسئلہ نوعِ انسانی کی تاریخ کا عظیم ترین مسئلہ قرار پا چکا ہے۔
عہدِ حاضر کے مفکرین نے اسے حل کرنے کے لئے مختلف نظریات پیش کئے
ہیں۔ یہ نظریات انسانی ذہن کے تازہ بہ تازہ تجربات کی پیداوار ہیں۔
اس کے مقابلہ میں پرویز صاحب کی گرانمایہ تصنیف

نظامِ ربوبیت

اس مسئلہ کا وہ نکھرا ہوا حل پیش کرتی ہے جو نوعِ انسانی کے لئے بارگاہِ رب العالمین
سے عطا فرمودہ آخری کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔ "نظامِ ربوبیت" اپنی نوعیت کی بے مثال
کتاب ہے ——————— رعایتی قیمت چار روپے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

ایک سہیلی کے نام خط

پیاری .....

بہت بہت سلام۔

تمہارا ہمیشہ تقاضا رہا کہ میں درس میں جاتی ہوں تو سارا درس نہیں تو کم از کم اس کے اہم حصے تمہیں لکھ بھیجا کروں۔ لیکن میں اب تک تمہارے اس تقاضے کو پورا نہ کر سکی۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ ایک تو درس میں اتنا کچھ سامنے آجاتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کسے اہم قرار دوں اور کسے غیر اہم۔ پھر یہ بھی مشکل ہے کہ پرویز صاحب کے حقائق کو بیان کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں؟ لیکن اس معذرت کے باوجود ان کے کل کے درس میں ایک ایسی بات سامنے آئی ہے جس سے تمہیں محروم رکھنا بڑا ہی بخل ہوگا ـــــ یا شاید گناہ!

درس کا موضوع تھا پردہ ـــــ سچ پوچھو تو میں بھی اپنی بعض ہم درسوں کی طرح اسی خیال کی تھی کہ اس پرانے فرسودہ موضوع پر کون سی نئی بات سامنے آئے گی۔ لیکن اس میں ایک ایسی بات سامنے آئی ہے جسے اس سے پہلے کم از کم میں نے کہیں سنا نہ کہیں پڑھا۔ اور بات انوکھی ہونے کے علاوہ اتنی بلند ہے کہ میں جوں جوں اس پر غور کرتی ہوں اپنے اندر ایک عجیب کیفیت پاتی ہوں۔ تم بھی سنو! ـــــ لیکن مشکل پھر وہی ہے کہ میرے پاس وہ الفاظ کہاں ہیں جن میں بات ٹھیک ٹھیک بیان ہو سکے۔ بہرحال جو کچھ میں سمجھ سکی ہوں اسے اپنے الفاظ میں بیان کرتی ہوں۔

بات یہ سامنے آئی کہ قرآن کریم نے عورتوں سے کہا ہے کہ وہ اپنی زینت کی چیزوں کی نمائش نہ کریں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ یہ عورتوں پر ایک سخت قسم کی پابندی لگائی گئی ہے۔ لیکن یہ پابندی نہیں۔ بات کچھ اور ہے۔ غور سے سنئے۔

دنیا میں کسی حیوان نے وہ کچھ اپنے جوڑے کے ساتھ نہیں کیا جو انسان نے (یعنی مرد نے) عورت کے ساتھ

کیا ہے۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ عورت اس کی محکوم رہے۔ تابع فرمان رہے۔ اپنے آپ کو مرد کے مقابلہ میں پست اور ذلیل سمجھے۔ لیکن کسی کو ہمیشہ کے لئے اس طرح محکوم اور تابع فرمان رکھنا مشکل کام ہے۔ ایسے مشکل کام کو اسی صورت میں آسان بنایا جاسکتا ہے کہ اس کے دل میں یہ عقیدہ پیدا کرایا جائے کہ وہ فی الحقیقت ہے ہی ایسی۔ خدا نے اسے بنایا ہی ایسا ہے — یہی وہ حربہ تھا جسے برہمن نے استعمال کیا۔ اور "شودر" سے کہہ دیا کہ وہ "برہما" کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ سر (برہمن) کی خدمت کرے۔ دوسرے اس مقصد کے لئے ایک "مقدس افسانہ" تراشا۔ یہ افسانہ تورات میں درج ہے — اس تورات میں جو معرف ہے۔ وہ افسانہ یہ ہے کہ اللہ میاں نے "آدمؑ" کو پیدا کیا۔ یعنی مرد کو۔ مقصد مرد ہی کو پیدا کرنا تھا۔ فطرت کے پروگرام میں عورت کا کوئی کام ہی نہ تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد دیکھا کہ مرد اداس اداس سا رہتا ہے۔ اس کی تنہائی کا رفع کرنا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ ایک دن وہ سو رہا تھا کہ اس کی پسلی چیر کر اس میں سے عورت کو باہر نکالا گیا تاکہ مرد کا جی بہل جائے۔

اس "مقدس افسانے" سے عورت کے دل میں یہ عقیدہ پیدا کیا گیا کہ فطرت کے نزدیک مقصود بالذات مرد کا وجود ہی ہے۔ عورت کو مرد کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی اداسی دور کرنے کے لئے۔ اس کے ایک تقاضے کو پورا کرنے کے لئے۔ یعنی جس طرح کائنات کی ہر چیز کے متعلق کہا ہے کہ اسے انسان کی خاطر مسخر کر دیا گیا ہے یعنی ان کی پیدائش انسان کے کسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ اسی طرح عورت کے دل میں یہ عقیدہ پختہ کر دیا گیا کہ اس کی پیدائش مرد کے ایک مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ اگر مرد کو اس کی ضرورت نہ ہوتی تو کائنات میں عورت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس سے عورت خود بخود مرد کے مقابلہ میں پست اور ذلیل ہوگئی۔ وہ اپنی نظروں میں آپ گر گئی۔

یہ خیال عورت کے دل میں اتنی پختگی سے گھر کر چکا ہے کہ وہ اگرچہ بظاہر سمجھتی ہے کہ یہ خیال اس کے دل سے نکل گیا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ اس کے دل سے اب تک نہیں نکلا۔

انہوں نے کہا کہ یورپ کی عورت کو دیکھو۔ وہ بزعم خویش سمجھتی ہے کہ وہ مرد کی گرفت سے آزاد ہو چکی ہے۔ وہ ہر میدان میں اپنے آپ کو مرد کے برابر بلکہ اس سے بھی آگے سمجھتی ہے۔ وہ ہر اس خیال سے سرکشی برتتی ہے جس سے کسی طرح یہ پایا جاتا ہو کہ وہ مرد سے کمتر درجہ پر ہے لیکن اس "مقدس افسانے کا اثر" اس قدر گہرا ہے کہ مغرب کی عورت بھی اپنے آپ کو اس سے آزاد نہیں کر سکی۔ وہ دن بھر محنت مشقت کے بعد اپنے لئے روٹی پیدا کرتی ہے تاکہ وہ مرد کی محتاج نہ رہے۔ اس کے بعد گھر آتی ہے تو اپنی محنت کی کمائی سے آرائش

زینت کا سامان خریدتی ہے۔ پھر بن سنور کر باہر نکلتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ کس مقصد کے لئے کرتی ہے؟ صرف اس لئے کہ وہ مردوں کی نگاہوں میں جاذب بن جائے۔ یعنی اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ خیال کروٹ لیتا ہے کہ اس کی ہستی کا مقصد مرد کی نگاہوں کے ایک تقاضے کو پورا کرنا ہے۔ اگر کہیں ایسا انتظام کر دیا جائے کہ دو چار روز کے لئے مرد باہر نہ نکلیں تو تم دیکھو گے کہ کوئی عورت بن سنور کر باہر نہیں نکلے گی۔

عورت اس وقت تک اس "افسانے" کے سحر سے مسحور ہے اور اپنے مقام سے بے خبر۔

اسے اس کے صحیح مقام سے، قرآن شریف نے آگاہ کیا اور اس سے کہا کہ تیری ہستی فطرت کے پروگرام کا ایک اہم جزو ہے۔ تیرا وجود مقصود بالذات ہے۔ تو مرد کے کسی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے پیدا نہیں کی گئی۔ تیرے دل میں اظہارِ زینت کا جذبہ اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ تو اپنے آپ کو مرد کا کھلونا سمجھتی ہے۔ اس خیال کو دل سے نکال دے۔ اور یہ خیال اس وقت دل سے نکلے گا جب تیرے اندر یہ جذبہ بیدار نہیں ہوگا کہ تو اپنی زینت کی چیزوں کی نمائش غیر مردوں کے سامنے کرے۔

یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے قرآن شریف نے مومن عورتوں سے کہا کہ اپنی زینت کی چیزوں کی غیر دل کے سامنے نمائش نہ کیا کرو۔ باہر نکلو تو اس انداز سے کہ یہ خیال تک بھی تمہارے دل میں نہ آئے۔ اور جب یہ خیال تمہارے دل سے نکل جائے گا تو تم اپنے صحیح مقام کو پہچان لوگی۔ اور وہ مقام یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں انسان ہیں، اور دونوں کا وجود فطرت کے نقشے میں اپنا اپنا مقام رکھتا ہے۔ نہ عورت مرد کے لئے ہے نہ مرد عورت کے لئے۔ یہ دونوں ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔

میں .... بیان نہیں کر سکتی کہ پرویز صاحب نے اس نکتہ کی وضاحت کن الفاظ میں کی تھی۔ درس میں ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی کہ ہم محسوس کر رہی تھیں کہ فی الواقعہ ہمارا مقام بلند ہو رہا ہے اور یہی احساس اس وقت تک مجھ پر طاری ہے اور اس کے ماتحت میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ تمہیں اپنے تاثرات لکھے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرے الفاظ سے وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن بہر حال میں نے کوشش کی ہے کہ اس کا مفہوم تم تک پہنچا سکوں۔

اب درس میں عورتوں کی تعداد خاصی ہو رہی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ رفتہ رفتہ کالج کی اسٹوڈنٹس اس میں زیادہ دلچسپی لے رہی ہیں۔ تم اس دفعہ لاہور آؤ تو ایسا پروگرام بنا کر آنا کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ آوازیں یہاں مل جائیں۔ کیا یہ فطرت کی ستم ظریفی نہیں کہ تم مجھے ادھر

کھینچ کرلائیں اور تم خود ہی اس سے محروم ہو۔ حالات ہمیں کیسا مجبور کر دیتے ہیں۔!

چچی جان سے میرا بہت بہت سلام کہنا۔ والسلام۔

۱۵/ اکتوبر

تمہاری ......

لغات القرآن

(مکمل چار جلدوں میں)

یہ قرآن کے الفاظ کی لغات ہی نہیں بلکہ بجائے خویش ایک تفسیر ہے۔ جسے عربی زبان کی مستند کتب لغت اور خود قرآن کریم کی آیات سے مرتب کیا گیا ہے۔ تفسیر کی طرح اس کا مطالعہ کیجئے تو قرآن کریم کی پوری تعلیم سامنے آجاتی ہے۔ چاروں جلدوں کی مجموعی قیمت ۵۷/- روپے ہے لیکن پورا سیٹ ۵۰/- روپے میں دیدیا جائے گا۔

مفہوم القرآن

(پورا قرآن مجید ایک ایک پارہ کرکے)

اگر آپ یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ الحمد سے والناس تک قرآن کریم کا صحیح مطلب کیا ہے تو مفہوم القرآن پڑھئے۔ اس کے ابھی تک سات پارے شائع ہو چکے ہیں آٹھواں پارہ زیر طبع ہے۔ پہلے پارہ کی ضخامت ۱۸۰ صفحات اور قیمت ۲ روپے ہے۔ (اس کے سستے ایڈیشن کی قیمت ایک روپیہ ہے)

باقی ہر پارہ کی قیمت ۲ روپے ہے

تمام پارے بلاک میں چھپے ہیں

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مجلسِ اقبالؒ

بیا بہ مجلسِ اقبالؒ و یک دو ساغر کش
کہ گرچہ سر نہ تراشد، قلندری داند

مثنوی ـــــ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

طلوعِ اسلام میں ایک مستقل عنوان ـــــ مجلسِ اقبالؒ ـــــ قائم کیا گیا تھا۔ اس عنوان کے تحت حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی دو ابتدائی مثنویوں (اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی) کی شرح اس انداز سے (مسلسل) پیش کی گئی تھی کہ اقبال کی فکر اور ان کا پیغام، قرآن کریم کی روشنی میں نکھر کر سامنے آجاتے تھے۔ اس اندازِ تشریح کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ حتیٰ کہ ان مثنویوں کے خاتمہ پر قارئین کی طرف سے تقاضا ہوا کہ انہیں کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ ان کی افادیت محفوظ اور عام ہو جائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض قانونی دشواریوں کی وجہ سے ہم ابھی تک اس تقاضا کو پورا نہیں کر سکے۔

اس اثنا میں ایسے اہم عملی مسائل سامنے آنے شروع ہو گئے جنہیں ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وجہ سے بعض مستقل عنوانات کو پس پشت ڈالنا پڑا ـــ کیا کیا جائے ـــ دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار ـــ انہی میں مجلسِ اقبالؒ کا عنوان بھی تھا۔ اس عنوان کی تجدید کے لئے قارئین کی طرف سے مسلسل تقاضے موصول ہوتے رہے ـــ ہمیں خود بھی اس کا شدت سے احساس تھا۔

ہمارے اس احساس کو تیز تر کرنے کا باعث ایک اور خیال بھی ہوا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ قوم آہستہ آہستہ

اقبالؒ کو فراموش کر رہی ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اسے قریب قریب فراموش ہی کر دیا گیا ہے۔ ویسے تو ایک جذباتی

زود فراموشی

اور ہنگامہ پرور قوم کے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے کسی عمل میں بھی استقامت نہیں ہوتی۔ وہ بگولے کی طرح اٹھتی ہے اور آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ ہماری حرکت و عمل کی ساری تاریخ ہماری اس نفسیات کی شاہد ہے۔ قوم نے اقبالؒ کو یاد کرنا شروع کیا تو اس ہنگامہ آرا شدت کے ساتھ کہ در و دیوار اس نام اور پیام سے گونج اٹھے اور اس کے بعد فراموش کیا تو اس حیرت افزا سکوت کے ساتھ کہ گویا یہاں کی فضائیں اس تذکرہ سے کبھی شناسا ہی نہیں تھیں۔ قوم کی اس نفسیات کے علاوہ اقبالؒ کے پیغام کو نگاہوں سے اوجھل کرنے میں، یہاں بعض اور محرکات بھی کارفرما رہے ہیں ——— اور کارفرما ہیں ——— نتیجہ اس کا یہ کہ اسلام کا یہ اتنا بڑا پیغام بردار اور قوم کا ایسا عظیم محسن، ماضی کی داستان بن کر رہ گیا ہے۔ اس سے اقبالؒ کا کچھ نہیں بگڑا نہ بگڑے گا۔ وہ تو ان زندہ جاوید شخصیتوں میں سے ہے جن کے متعلق بجا طور پر کہا گیا ہے کہ ——— ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔ اس سے قوم ایک گراں بہا متاع سے محروم ہو رہی ہے ——— اور ستم بالائے ستم کہ اسے اس محرومی کا احساس تک نہیں ہو رہا۔ خود حضرت علامہؒ کے الفاظ میں ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اندریں حالات طلوع اسلام اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ فکرِ اقبال کے تذکرہ کو بدستور زینت دہِ محفل رکھے۔ فریضہ اس لئے کہ طلوع اسلام خود حضرت علامہ کے ایما سے جاری ہوا۔ یہ نام بھی انہی کا تجویز فرمودہ ہے۔ اور اس کے بعد یہ انہی کی یاد میں جاری رہا۔ تحریک پاکستان کے دوران میں اس نے، انہی کی فکر

اقبال کی اہمیت

جہاں تاب کی روشنی میں، انگریز، ہندو اور قومیت پرست مسلمانوں کے خلاف چومکھی لڑائی لڑی۔ اور قیام پاکستان کے بعد یہ انہی کے تصورات کے مطابق معاشرہ کی تشکیل جدید کے لئے کوشاں رہا۔ کوشاں ہے۔ اور بہ توفیق ایزدی، کوشاں رہے گا۔ یہ اس لئے کہ یہ اقبالؒ کے تصورات خود قرآن کریم کی شمع نورانی سے مستنیر ہیں۔ اقبال سے ہماری عقیدت بھی اسی بنا پر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم اقبالؒ کی فکر کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھتے اور پیش کرتے ہیں۔

اس سلسلہ کی تجدید کے لئے ہم نے، سب سے پہلے، ان کی مشہور مثنوی

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

کا انتخاب کیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ یعنی ان کی وفات سے صرف دو سال قبل

زیر نظر مثنوی یہ بڑی مختصر سی کتاب ہے لیکن یوں سمجھئے کہ اس میں فکر اقبال نچوڑ کر آگیا ہے۔ انہوں نے جس پیغام کی ابتدا اسرار و رموز سے کی تھی اور پھر اسے تمام عمر مختلف طرق و اسالیب سے دہراتے رہے، اس مثنوی میں وہ نہایت جامعیت کے ساتھ سامنے آگیا ہے۔ اس کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ جب سیاست، وحی کی روشنی سے محروم ـــ یا بیباک ہو جاتی ہے (جیسا کہ مغرب میں ہوا) تو اس کا نتیجہ کس قدر انسانیت سوز اور فساد انگیز ہوتا ہے۔ اور جب وہ وحی کی راہ نمائی میں جادہ پیما ہوتی ہے تو اس دنیا کو کس طرح جنت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اقبالؒ نے اپنی تنقید کا ہدف براہ راست اہل مغرب کو قرار دیا تھا۔ اس لئے کہ ان کے زمانے میں سیاستِ بیباک کا سرچشمہ اور اولین آماجگاہ وہی سرزمین، اور وہیں کی اقوام تھیں۔ لیکن آج اس موضوع کی اہمیت، خود ہمارے ہاں مغرب سے بھی زیادہ ہے۔ اس لئے کہ پاکستان اس وقت تک اسی قسم کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ یہاں کا قدامت پرست

پاکستان کے حالات طبقہ ایک ایسے نظام کی طرف دعوت دیتا ہے جس میں نہ اپنے حقیقی مفہوم میں دین ہے اور نہ ہی قابل عمل سیاست۔ اس سے تنگ آکر جدت پسند طبقہ ایک ایسے نظام کا متمنی ہے۔ جس میں مذہب کو پرستش گاہوں کی چاردیواری میں محبوس کر کے سیاست کو اس سے بیباک رکھا جائے۔ (اسی کو سیکولرازم کہتے ہیں) لہٰذا پاکستان میں اس کی اشد ضرورت ہے کہ اس نظام معاشرہ کے خد و خال کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے۔ جسے قرآن کریم کی روشنی میں اقبال نے پیش کیا تھا۔ اور جس کی عملی تشکیل کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور قوم کو دیا تھا۔ لیکن مغرب کی سیاستِ بیباک تک آنے سے پہلے ایک اہم سوال سامنے آتا ہے۔ یہ سوال درحقیقت اس تمام بحث کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی کے تمام معاملات تنہا عقل انسانی کی رو سے طے کئے جا سکتے ہیں۔ یا اس کے لئے وحی کی رہنمائی کی بھی ضرورت ہے؟ اہل مغرب

عقل اور وحی کا فیصلہ یہ تھا کہ عقل کے علاوہ کوئی اور سرچشمہ علم نہیں۔ اس لئے انسانی معاملات بہ تمام و کمال تنہا عقل کی رو سے طے ہو سکتے ہیں۔ ہیکل کے الفاظ میں۔

> ہم دنیا کے متعلق صحیح علم اور اس کے مسائل کا صحیح حل، صرف عقل کی رو سے دریافت کر سکتے ہیں۔ عقل انسان کے لئے نعمت عظمیٰ ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اسے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ وحی یا معتقدات کا تصور دانستہ یا نادانستہ یکسر فریب پر مبنی ہے۔[1]

[1] RIDDLE OF THE UNIVERSE ——— ERNST HAECKEL

اقبالؒ نے اس باطل تصور کی پرزور اور پرجوش تردید کی اور کہا کہ تنہا عقل انسانی معاملات کو حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے وحی کے تابع رکھنا ضروری ہے۔ اس بنیادی نقطہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس نے اس مثنوی کی ابتدا ان چار اشعار سے کی ہے جو

بخوانندۂ کتاب

کے عنوان سے مثنوی میں درج کئے گئے ہیں۔ پہلا شعر ہے۔

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

حرم (دین کے مقتضیات) کو عقل کی بے باکی اور سرکشی سے سخت خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس کی مدافعت اور مقابلہ کے لئے میں مملکتِ عشق سے تازہ سپاہ لے کر اٹھا ہوں۔

اقبال کے ہاں آپ کو۔ عقل و عشق۔ خرد و جنوں۔ خبر و نظر۔ ذکر و فکر جیسی تقابلی اصطلاحات عام ملیں گی۔ اس کا سارا کلام ان اصطلاحات سے معمور ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے، اگر ان اصطلاحات میں عشق، جنون، نظر، ذکر وغیرہ سے مراد وحیٔ خداوندی اور اس کی رُو سے عطا شدہ علم لے لیا جائے اور عقل و خرد و خبر و فکر سے مفہوم وہ "فکرِ گستاخ" جو اپنے آپ کو وحی کی روشنی سے مستغنی سمجھ کر اس کی عائد کردہ حدود سے سرکشی اختیار کر لیتا ہے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کا فلسفیانہ ذوق رکھنے والا طبقہ، اس سے کچھ اور مراد لے کر قدیم متکلمانہ بحث میں اُلجھ جاتا ہے۔ فلسفہ کی دنیا میں۔ علم کے دو سرچشمے تسلیم کئے جاتے ہیں۔

عقل و عشق کا تصادم

ایک عقل اور دوسرا وجدان۔ صوفیانہ کشف و الہام اور وجد و حال، سب وجدان کے دائرے میں آجاتے ہیں۔) واضح رہے کہ وحیٔ نبوت اس سے یکسر الگ حقیقت ہے)۔ وجدان کے حامی عقل کی سخت تنقیص کرتے ہیں اور اس کے پیچھے لٹھ لے کر پڑتے ہیں۔ فلسفی اور صوفی کی جنگ و جدال کی داستان بڑی قدیم اور مسلسل ہے۔ صوفی پائے استدلال کو چوبیں اور سخت بے تمکین قرار دیتا ہے۔ استدلالی فلسفی صوفی کی باطنی کیفیات کو واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔ اسے عجب اتفاق کہئے کہ اقبالؒ بھی باطنی واردات کیفیات کا قائل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل و وجدان کی کشمکش کی بحث کرتے ہیں۔ تو اقبال کو "وجدانیوں" کی صف میں کھڑا کر کے۔ عقل کا بدترین دشمن قرار دیتے ہیں۔ اقبال کی پوزیشن اس باب میں منفرد ہے۔ وہ جب عقل کے مقابلہ میں عشق کو لاتے ہیں تو اس سے ان کی مراد وحیٔ نبوت ہوتی ہے۔

کہ صوفیانہ واردات باطنی اور عقل سے ان کا اشارہ ہوتا ہے اس عقل کی طرف جو وحی سے سرکشی برتے، نہ کہ مجرد عقل۔ یہ اس لئے کہ ایک تو قرآن، کشف والہام جیسے وجدان کی کوئی حیثیت ہی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اکتسابی علم کا ذریعہ عقل اور اس کے مشاہدات کو قرار دیتا ہے۔ اور غیر اکتسابی علم کا ذریعہ وحی کو جو خاصۂ نبوت ہے۔ اور نبوت چونکہ نبی اکرمؐ پر ختم ہو چکی ہے۔ اس لئے اب علم کا ذریعہ قرآن اور اس کی روشنی میں کام کرنے والی عقل کے سوا اور کوئی نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ قرآن کریم، عقل کو بڑا بلند مقام عطا کرتا ہے۔ وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو بدترین مخلوق بلکہ جہنمی قرار دیتا ہے۔

صحیح مفہوم

اقبال کا دعوٰے ہے کہ اس نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ کہا ہے اسی کی روشنی میں کہا ہے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اقبالؒ اس قدر اہم اور بنیادی مسئلہ میں قرآن کی تعلیم کے علی الرغم، عقل کی تنقیص کرے اور وجدان کو اس کے مقابلہ میں، یقینی ذریعہ علم اور قابلِ اعتماد راہ قرار دے[1]۔

بہرحال ہم اقبال اور قرآن کے مطالعہ سے اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان کے ہاں عشق و نظر وغیرہ سے مراد وحی نبوت (قرآن کریم) ہے۔ اور عقل سے مراد مغرب کا وہ نظریہ جو وحی کی راہ نمائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اس نظریہ کی تنقیص کرتے ہیں اس سے ان کی نگاہ میں دین کے مقتضیات کو سخت خطرہ ہے۔ وہ مسلمانوں کو بالخصوص ہمارے ہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو، اس خطرہ سے آگاہ کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ کے لئے وحی کی بارگاہ سے دلائل اور شواہد کا لشکرِ جرار اکٹھا کر کے میدان میں آئے ہیں۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں۔

زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ اورا   جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است

لوگ خواہ مخواہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ عقل اور وحی دو متضاد عناصر ہیں جو ایک دوسرے میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ یہ صحیح نہیں۔ وحی کی قبا ایسی ہے جو عقل کی قامت پر موزوں آتی ہے۔ وحی خود اپنے آپ کو عقلی دلائل سے منواتی ہے۔ لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ انسانی عقل کی جو سطح ہو وہ اس کے مطابق

---

[1] اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے کہ حضرت علامہ علم و دانش کی ایسی بلندیوں کے باوجود بالآخر انسان تھے اور ہر انسان کی طرح ان سے بھی غلطی ہو جانے کا امکان تھا اس سے ان کے مقام کی بلندی میں فرق نہیں آجاتا۔ انہوں نے بہ حیثیتِ مجموعی جو کچھ کہا ہے وہ قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے۔

عقل اور وحی کا تعلق

دلائل دے کر اسے حقیقت کا قائل کراتی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ عقل زندگی کے غیر متبدل اصولوں کو دریافت نہیں کر سکتی۔ یہ کام وحی نے کیا ہے۔ لیکن جو اصول وحی نے پیش کئے ہیں وہ سمجھے عقل ہی کی رُو سے جا سکتے ہیں۔ اس لئے عقل اور وحی میں وہی رشتہ ہے جو انسانی آنکھ اور سورج کی روشنی میں ہے۔ انسانی آنکھ روشنی کے بغیر بیکار ہے اور جس روشنی سے فائدہ اٹھانے والی کوئی آنکھ نہیں وہ روشنی اپنا مقصد پورا نہیں کرتی۔

تیسرا شعر ہے۔

بآں مقام رسیدم چو در برش کردم ... طوافِ بام و درِ من سعادت خرد است

میں وحی کے اتباع سے یا اپنی فکر کو اس سے ہم آہنگ کر لینے سے اس مقام پہ پہنچ گیا ہوں کہ عقل میرے در و بام کے طواف کرنے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب عقل، وحی کے پیش کردہ حقائق کا ادراک کر لیتی ہے اور اس کی عظمتوں سے آشنا ہو جاتی ہے تو وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ خود کس قدر بلند اور باعظمت ہو گئی ہے۔ عقل کے لئے وحی کا اتباع، باعثِ ہزار فخر و مباہات ہے۔ اس قوم کے مقام کے کیا کہنے جو وحی کی راہ نمائی میں عقل سے کام لے کر سفرِ حیات طے کرے۔ یہی قوم، امامت اقوام کی سزاوار ہے۔ وحی ہر قدم پر عقل کی نگرانی کرتی رہتی ہے کہ وہ کسی گڑھے میں نہ جا گرے۔ کہیں غلط موڑ نہ مڑ جائے۔

اس لئے اقبالؒ نے چوتھے شعر میں کہا ہے کہ

احتسابِ کائنات

گماں مبر کہ خرد را حساب و میزاں نیست
نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است!

اگر عقل کو انسانی معاملات میں آخری اتھارٹی تسلیم کر لیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں رہتی جو اس کا فیصلہ کر سکے کہ عقل نے جو قدم اٹھایا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ لیکن اگر اسے وحی کے تابع رکھا جائے تو وحی قدم قدم پر اس کا احتساب کرتی رہتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کو شہداء علی الناس قرار دیا ہے۔ یعنی اقوام عالم کے اعمال کی نگران۔ ان کی نگرانی درحقیقت وحی کی نگرانی ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب عقل کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو وہ انسانی جذبات۔ رجحانات۔ میلانات اور مفادات کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس طرح ایک فرد یا ایک گروپ کے مفادات کا ٹکراؤ

دوسرے فرد یا گروپ کے مفادات سے ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ فساد فی الارض ہے۔ لیکن اگر عقل، وحی کے مقرر کردہ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن جائے۔ تو وہ نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کا موجب بن جاتی ہے۔ جس سے یہ دنیا جنت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

بس یہ ہے اقبالؒ کے پیغام کا ماحصل جسے اس نے انتہائی ایجاز و جامعیت کے ساتھ اس مثنوی میں پیش کیا ہے۔ اس کی تمہید آئندہ قسط میں سامنے لائی جائے گی۔ وہو المستعان۔

طاہرہ کے نام خطوط

ماؤں کی آغوشِ تربیت ہر قوم کی داستانِ عروج و زوال کا حرفِ آغاز بنتی ہے۔ خدا کا دینِ ملت کی ہر بہو بیٹی اور ماں کو کس بلند مقام پر فائز کرتا ہے؟ ان کے قلب و نگاہ میں کس قسم کا انقلاب لانا چاہتا ہے؟ اس انقلاب کی بدولت ہماری عائلی زندگی کے تلخابے کیونکر جامِ شیریں کی گردش میں بدل سکتے ہیں؟ نئی نسل کی تربیت کس حُسنِ انداز سے ہو گی؟

ان اہم سوالات کا جواب، قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں، اس کتاب میں دیکھئے۔
ان خطوط کے ذریعہ پرویز صاحب نے اپنی ملت کی ہر طاہرہ بیٹی کو قرآن کا زندگی بخش پیغام دیا ہے

جلد اول ــــــ دو روپے جلد دوم ــــــ ڈھائی روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

حقائق و عبر

۱- اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں

ہفت روزہ المنبر (لائل پور) نے اپنی ۱۴ ستمبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ایک خصوصی مقالہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے — دین کے نام پر افتراق انگیزی اور اس کا علاج — اس میں اس نے بتایا ہے کہ اُمت اس وقت کس قدر تشتت و افتراق کے عذاب میں مبتلا ہو چکی ہے اور اسے دور کرنے کا طریق کیا ہے ؟ وہ "وحدتِ امت" کی اہمیت کے سلسلے میں لکھتا ہے۔

> امت ایک اکائی ہے۔ اور ناقابلِ تقسیم اکائی۔ اس کا نام بھی خدا نے خود ہی تجویز فرما دیا ہے (ھو سمکم المسلمین) لیکن فرقوں، احزاب، اور جماعتوں نے اسے اس طرح منقسم کر رکھا ہے کہ آغاز میں کسی کی فکر یا عقیدے میں بعض ذی علم افراد یا عناصر میں باہمی اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ وابستہ ہو کر دھڑوں میں بٹ جاتے ہیں۔ یہ دھڑے آگے چل کر فرقے یا عوامی جماعتیں بن جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے ذوق و فکر کی بنیاد پر ان فرقوں اور جماعتوں میں اختلاف اُبھر آتے ہیں۔ ان میں شدت آتی ہے۔ اور اختلاف مخالفت کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم عقیدہ جماعت اور فرقہ مختلف العقیدہ و مختلف الخیال جماعتوں اور فرقوں میں منقسم ہو جاتی ہیں۔ اور یہ سلسلہ لامتناہی صورت اختیار کر جاتا ہے۔

آج ٹھیک یہی صورت حال ہے۔ کوئی دینی جماعت۔ کوئی مذہبی فرقہ اور سیاسی تنظیم ایسی نہیں جو مختلف و باہم مخالف یا کم از کم ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے دلوں کی صورت اختیار نہ کر چکی ہو۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ امت کے تصور پر فرقوں اور جماعتوں کا تصور غالب آ چکا ہے۔

یہ تھا مرض۔ اب اس کا علاج ملاحظہ کیجئے۔ لکھتے ہیں۔

اس مرحلہ پر اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ علماء کا ایک مضبوط گروپ ایسا میدان میں آئے۔ جو کسی بھی فرقے کو اپنا مدمقابل خیال نہ کرتا ہو۔ نہ وہ اپنا انتساب کسی فرقے سے رکھتا ہو۔ بالفاظ واضح نہ وہ اہل حدیث کہلاتا ہو۔ نہ حنفی۔ نہ شیعہ۔ نہ دیوبندیت کا علمبردار ہو نہ بریلویت کا۔ وہ اپنے آپ کو "مسلم" کے الہٰی نام سے موسوم کرتا ہو اور واقعی اس کا دل ہر عصبیت سے پاک ہو۔

یہ وہی آواز ہے جسے طلوع اسلام پچیس سال سے بلند کرتا چلا آ رہا ہے لیکن جس کی اس قدر مخالفت ہوتی چلی آتی ہے۔ اب دیکھئے کس طرح زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، یہی حضرات جو ساری عمر فرقوں کے ساتھ وابستہ اور جماعتوں کی طرف منسوب رہے ہیں اس آواز کی طرف آ رہے ہیں۔ ہم اپنے اس مؤقر معاصر کو، اس کی اس صاف گوئی اور حقیقت رسی پر قابل مبارک باد سمجھتے ہیں۔

لیکن اس کے بعد سوال یہ سامنے آئے گا کہ یہ لوگ اپنے فرقہ وارانہ اختلافات کو چھوڑ کر ایک نقطہ پر اکٹھے کیسے ہو سکیں گے؟ جب تک اس سوال کا صاف اور واضح جواب نہیں دیا جائے گا۔ فرقہ واری کی مذمت اور وحدت امت کی تلقین، "وعظ" سے زیادہ حقیقت نہیں رکھے گی۔ اس سوال کا جواب ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر فرقہ اسے تسلیم کرلے کہ حق و باطل۔ غلط اور صحیح کا معیار ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا کی کتاب۔ جس کے منزل من اللہ اور منزہ عن الخطا ہونے پر سب کا ایمان ہے۔ اس کے بعد ہر فرقہ اپنے اپنے معتقدات و مسالک کو اس کسوٹی پر پرکھے۔ جو اس پر پورا اترے اسے صحیح سمجھ لیا جائے۔ اور جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کر دیا جائے۔ اختلافات اسی صورت میں دور ہو سکتے ہیں۔ اس کے سوا ان کے دور کرنے کی کوئی شکل نہیں۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ تمام دنیا کے انسانوں کے اختلافات مٹانے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ جب وہ دنیا بھر کے اختلافات مٹانے کی صلاحیت رکھتا ہے تو کیا وہ ہمارے اختلافات نہیں مٹا سکتا۔ وہ یقیناً ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ اسے حق و باطل کا معیار تسلیم کر لیا جائے۔

اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو اتفاق اور وحدت کے ہزار وعظوں کے باوجود ہم میں وحدت پیدا نہیں ہو سکے گی۔

۲۔ فتنۂ انکارِ حدیث کس طرح مٹ سکتا ہے؟

سنہری مسجد (لاہور) کے خطیب مفتی محمد علی صاحب نے، جشنِ درسِ حدیث کی تقریب پر فرمایا۔
میرے خیال میں کفر کے فتوے لگانے سے انکارِ حدیث کا فتنہ نہیں مٹ سکتا۔ اس کے سدِّباب کے لئے علمائے کرام کو عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔ اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس کے لئے احادیثِ صحیحہ کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت ضروری ہے۔
(کوہستان۔ ۱۲ نومبر)

بجا اور درست۔ لیکن ہم محترم مفتی صاحب کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ غلط احادیث کی نشر و اشاعت کو روک دیا جائے۔ یہ جن کتابوں میں موجود ہیں انہیں وہاں سے خارج کر دیا جائے۔ اور انہیں بطورِ حدیثِ رسول اللہ پیش کرنے کی ممانعت کر دی جائے۔ جب تک صحیح احادیث کی نشر و اشاعت کے ساتھ غلط احادیث کی روک تھام کا انتظام نہیں ہو گا۔ "فتنۂ انکارِ حدیث" کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ یہی وہ غلط حدیثیں ہیں جن سے یہ لوگ انکار کرتے ہیں۔ جب آپ حضرات یہ کہہ دیں گے کہ یہ حدیثیں ہی نہیں ـــ اور اس کے بعد، حدیثوں کے مجموعوں میں ان کا وجود باقی نہیں رہے گا تو ان سے انکار کا "فتنہ" خود بخود ختم ہو جائے گا۔ ان حدیثوں کو علیٰ حالہٖ رکھ کر یہ توقع رکھنا کہ دین سے محبت اور نبی اکرمؐ سے سچی عقیدت رکھنے والے، ان سے انکار نہیں کریں گے، ان کی محبت و عقیدت کا غلط اندازہ لگانا ہے۔

اب پوچھا یہ جائے گا کہ غلط حدیثیں کون سی ہیں۔ اس کا جواب بڑا آسان ہے۔
ہر وہ روایت جو قرآن کے خلاف جاتی ہے۔ یا جس سے نبی اکرمؐ یا صحابۂ کبارؓ کی ذات کے خلاف کسی قسم کا طعن پڑتا ہے۔ یا وہ عقل کے خلاف ہے۔ اور حس و مشاہدہ سے باطل ثابت ہوتی ہے غلط ہے۔

اور یہ بات محترم مفتی صاحب سے پوشیدہ نہیں ہو گی کہ یہ معیار ہمارا مقرر کردہ نہیں۔ خود ان کے ہاں بھی مسلّم ہے علامہ جوزیؒ نے حدیث کے پرکھنے کا یہی معیار بتایا ہے ـــ فرق منکرینِ حدیث اور حدیث ماننے والوں"

میں یہ ہے کہ اول الذکر اس معیار پر عمل کرکے احادیث کو پرکھ لیتے ہیں اور ثانی الذکر اس معیار کو اپنی کتابوں میں درج کرتے اور اپنے وعظوں میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن عملاً احادیث کو اس معیار پر جانچتے نہیں۔ اگر یہ حضرات عملاً ایسا کرنے لگ جائیں تو فتنۂ "انکارِ حدیث" ایک دن میں ختم ہو جائے۔

۳۔ کافرگری

مشرقی پاکستان کے متعلق تو ہمیں علم نہیں، مغربی پاکستان میں آج کل کافرگری کا مشغلہ بڑے زوروں پر ہے۔ کوئی قریہ اور بستی ایسی نہیں جس میں علمائے کرام کا ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرنے میں سرگرم عمل نہ ہو[1]۔ یہ فتنہ اس قدر شدت اختیار کر چکا ہے کہ ایسے اخبارات نے بھی جنہیں مذہبی نہیں کہا جا سکتا اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ضروری سمجھا ہے۔ چنانچہ ہفت روزہ چٹان (لاہور) نے اپنی ۸ اکتوبر کی اشاعت میں ایک اداریہ شائع کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔

مسلمانوں کو کافر کہنا جرم قرار دیا جائے

(فیلڈ مارشل محمد ایوب خان سے ایک التماس)

اس اداریہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

> ہم نے تین ہفتے پہلے چٹان میں کافرساز ملّا کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا تھا۔ جس میں عرض کیا تھا کہ وہ لوگ جو محراب و منبر پر کھڑے ہو کر فقہی مسائل کی آڑ میں مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں۔ اور غیر ضروری مسئلوں کا انبار پیدا کرکے مسلمانوں کی تکفیر پر تلے ہوئے ہیں انہیں اپنی اس حرکت سے باز آ جانا چاہیئے۔ ان کا یہ فعل مسلمانوں کی وحدت کو نہ صرف غارت کر رہا ہے۔ بلکہ ملک کی سالمیت کے لئے خطرناک ہونے کے علاوہ ایک ایسا طوفان اٹھا رہا ہے جس کا نتیجہ مسلمانوں کی بربادی اور پاکستان کی تباہی ہے۔

ان علماء کے متعلق آگے چل کر اسی اداریہ میں لکھا ہے۔

> اسی کا نتیجہ ہے کہ ناخواندہ مسلمانوں کا دین ان کے عقیدت خانوں کی جنس عام بن گیا ہے۔ اور جو لوگ مغرب کی تعلیم کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے ہیں وہ ان کے

---

[1] یہ "جہاد" خود سنّی حنفی مسلمانوں کے دو گروہوں ـــــ دیوبندی اور بریلوی کے درمیان برپا ہے۔

خط و خال، چہرے مہرے، وعظ و بیان، تقریر و تحریر، شرف و مجد، سیرت و صورت، جہالت، علم، قہر و غضب، طعام و کلام، اور پیام و دشنام سے دل برداشتہ ہو کر اسلام ہی سے آزردہ ہو رہے ہیں۔ اس طائفہ مقدسہ کو اس امر کا مطلقاً احساس نہیں کہ نئی پود اگر اسلام کے معاملہ میں بے ادب ہوتی جا رہی ہے تو اس کا سب سے بڑا سبب انہی حضرات کا وجود ہے۔ جن کی بات ایک عاجز دماغ شیر فروش تو سن لیتا ہے کہ وہ تقدیر پر راضی کر دیا گیا ہے۔ لیکن یونیورسٹی کا ایک متعلم یا معلم جن کے ہاتھ میں اب ملکت و معاشرہ کی تہذیب و ترتیب ہے ان باتوں کو بے معنی سمجھتا اور خار و خس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے نہ اس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام ہے اور نہ ہی اس تماشا کو ختم کرنے کی ضرورت سے کسی کو انکار۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مرض کا علاج کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ مرض فرقوں کے وجود کا فطری نتیجہ ہے۔ لہٰذا جب تک فرقے نہیں مٹتے یہ مرض جا نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کچھ وقت کے لئے اس مرض کی علامات میں سے کسی کو مٹا یا دبا دیں لیکن جب تک علتِ مرض باقی ہے مریض کو شفا نصیب نہیں ہو سکتی۔

اس میں شبہ نہیں کہ بحالاتِ موجودہ، فرقوں کا مٹا دینا آسان نہیں۔ بلکہ بعض یاس زدہ حضرات اسے ناممکن قرار دے دیتے ہیں لیکن اگر اس کی ابتدا کر دی جائے تو ایک دن، جسد ملت کا یہ رستا ہوا ناسور مندمل ہو سکتا ہے اس کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ جو چیز تمام فرقوں میں قدر مشترک اور متفق علیہ ہے اسے حق و باطل کا معیار قرار دے کر اختلافی مسائل کو پرکھنا شروع کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ قدر مشترک اور متفق علیہ بنیاد و حجت، خدا کی کتاب، (قرآن کریم) کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ لہٰذا اسے معیار اور کسوٹی تسلیم قرار دیدیا جائے۔

اگلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس قسم کے پرکھنے کا کام کون کرے؟ سو ظاہر ہے کہ اس کے لئے ایک مرکزی اتھارٹی کی ضرورت ہوگی۔ جب تک یہ اتھارٹی نہیں ہوگی، قولِ فیصل تک پہنچنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔

یہ ہے وہ عملی شکل جس کی طرف طلوع اسلام تشکیل پاکستان کے روز اول سے مسلسل و متواتر دعوت دیتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن جن لوگوں کے مفاد، فرقوں کے وجود کے ساتھ وابستہ ہیں۔ وہ اس دعوت کو بآسانی کس طرح قبول کر سکتے ہیں؟ طلوع اسلام کی مخالفت انہی لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور یہ مخالفت ہر اس فرد یا ادارہ کی ہوگی جو فرقہ پرستی کو مٹا کر وحدتِ ملت کی طرف دعوت دے گا۔ جن حضرات کے دل میں اسلام کی محبت اور ملت کا درد ہے انہیں اس مخالفت کو برداشت کرتے ہوئے اس دعوت کو عام کرنا ہوگا جو اس مخالفت کو مول نہیں لینا چاہتا اسے یہ آواز بلند نہیں کرنی چاہیئے اور اس آواز کو بلند کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ خود کسی فرقے سے متعلق نہ ہو۔ صرف مسلمان ہو۔

راستے میں چھ

راولپنڈی سب کنونشن

۲۹۔۳۰ ستمبر کو طلوعِ اسلام سب کنونشن پاکستان کے عبوری دارالسلطنت راولپنڈی میں قرار پائی تھی۔ سالانہ کنونشن کے عظیم اجتماع کے بعد، بزموں کے نمائندوں کا یہ دوسرا سالانہ، مختصر لیکن نمائندہ اجتماع ہوتا ہے۔ جہاں قرآنی تحریک کے طائرانِ پیش رس کو مل بیٹھنے کے ضمنی مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ بے تاب آرزوئیں دو روز قبل ہی سے احباب کو کشاں کشاں راولپنڈی کی سمت لئے چلی آرہی تھیں۔ الکوثر کے میزبان کراچی سے لے کر مردان اور لیشاور تک کے مہمانوں کے لئے چشم براہ تھے۔ ۲۹ ستمبر کی دوپہر تک یہ سب نمائندے راولپنڈی پہنچ چکے تھے اور اسی دوپہر کو جب ان کے سالارِ انقلاب بذریعہ ٹرین راولپنڈی پہنچے تو پُرشوق نگاہیں انہیں والہانہ نذرِ تحسین پیش کر رہی تھیں اسی شام کے ۶ بجے ریلوے انسٹی ٹیوشن ہال میں "شہنشاہ بوریہ نشین" کے عنوان سے پرویز صاحب کو بارگاہِ رسالت مآب میں خراجِ عقیدت پیش کرنا تھا۔ اور جب مولانا عبدالرب صاحب کی صدارت میں جلاس کا باضابطہ آغاز کیا تو برآمدوں اور گیلریوں تک ہال کی وسعتیں کھچا کھچ ہر مکتبِ خیال کے سامعین سے بھرپور تھیں۔ محترم عزیز قریشی کی تلاوتِ کلام پاک اور خلیل مرزا صاحب کی نظم کے بعد شاد صاحب نے نپے تلے اور موزوں الفاظ میں مفکرِ قرآن کا تعارف کرایا۔ اور اس کے بعد مذکورہ اہم عنوان سے پرویز صاحب نے اپنے بصیرت افروز خطاب کا آغاز کیا۔ اسلامی مملکت کے صدرِ اول کی حیثیت سے عرب و عجم کے "تاجدارِ اعظم" نے جو درخشندہ و تابندہ نقوش اقوام عالم کی راہوں میں ثبت کئے۔ ان کے تذکارِ جلیلہ اور پرویز صاحب کا حسنِ بیان۔ چاروں طرف جوش تاثر کا ایک دلکشا سماں طاری تھا اور مخالف و موافق سب کی نگاہیں آنسوؤں سے لبریز۔

ان اشکوں نے افتراپردازیوں کے اس سارے گرد وغبار کو دھو ڈالا جو مفکرِ قرآن کے خلاف دلوں میں آئے دن مخالفین کی طرف سے بٹھایا گیا۔ اور خطاب کے بعد جب استفسارات کا مرحلہ آیا تو پرویز صاحب دل کی گہرائیوں تک اپنے علم وبصیرت کے خلوص کی کشش چھوڑ گئے۔

۳۰ ستمبر کی صبح کو ناشتے کے بعد، الکوثر کے وسیع صحن میں بزمہائے طلوع اسلام کے نمائندوں کا خصوصی اجلاس محترم عزیز احمد قریشی نمائندہ بزم راولپنڈی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد پرویز صاحب اپنے رفقائے سفر سے خطاب کے لئے سامنے آئے اور اپنے مخصوص دل نشین انداز میں صورتِ حال کے نشیب وفراز کو پوری وضاحت سے نمائندوں کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے تفصیلاً بتایا کہ قرآن کی روشنی کو چاروں طرف پھیلتے دیکھ کر مفاد پرست عناصر کیونکر اس کے آڑے آ رہے ہیں اور کس جوش وخروش سے اس روشنی کے داعیوں کے گرد اگرد مخالفت کا ایک حصار تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی مفاد پرستیوں کا تقاضا یہی ہے۔ آپ کا فریضہ یہ ہے کہ اس حصار کو توڑ کر رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوگا قرآن کی روشنی تاریک فضاؤں میں جلوہ بار نہیں ہوگی۔

محترم پرویز صاحب کے بعد مولانا عبدالرب صاحب نے خطاب کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ طلوع اسلام میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اور طلوع اسلام کی اشاعت کم از کم دس ہزار تک پہنچا دی جائے۔

محترم حاجی عبدالمجید صاحب نے اس کے لئے ایک سب کمیٹی کی تشکیل کی تحریک کی۔ محترم عزیز احمد قریشی اور راجہ محمد اکرم ایڈووکیٹ کی تائید کے بعد محترم راجہ صاحب موصوف کی سرکردگی میں ایک سب کمیٹی کے قیام کا فیصلہ ہوا اور خلیل مرزا صاحب، شیخ سراج الحق صاحب اور میاں عبدالخالق صاحب ان کے رفقاء کی حیثیت سے اس سب کمیٹی کے ارکان منتخب ہوئے۔

اسی شام کو ۵ بجے پرویز صاحب نے پریس کلب میں اخباری نمائندوں سے خطاب کیا اور پاکستان میں اسلامی آئین کی اصل وبنیاد کو روشنی میں لاتے ہوئے واضح کیا کہ اس مقصد کے لئے لازماً ہمیں اس قدرِ مشترک کو طے کرنا ہوگا جو سب کے لئے ایک متفق علیہ آئین کی اساس بن سکے۔ اور اس لحاظ سے ہمارے پاس قرآن ہی وہ واحد کتاب ہے جسے ہر فرقہ اور گروہ باہمی اختلاف سے بالاتر سمجھتا ہے۔ اسی کتاب کو آپ اپنے آئین کی بنیاد قرار دیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ اس پر جو دستوری عمارت استوار ہوگی وہ کس قدر پائیدار ثابت ہوگی۔

پرویز صاحب نے اخباری نمائندوں کے مختلف سوالات کے اطمینان بخش جواب دئیے۔ شام کے سات بجے پرویز صاحب کو ایک مجلس استفسارات سے عہدہ برآ ہونا تھا۔ یہ مجلس الکوثر کے صحن میں منعقد ہوئی۔ مفکر قرآن نے اپنے مخصوص دلنشین اور بصیرت افروز انداز میں اہم سوالات کے جواب دئیے جس سے کتنے ہی مسائل کی گرہیں کھلتی چلی گئیں۔

یکم اکتوبر کی دوپہر کو پرویز صاحب نے مقامی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کیا۔ اسلامی آئین وقوانین کے مضمرات

پر اپنے مخصوص فاضلانہ انداز سے روشنی ڈالتے ہوئے پرویز صاحب نے کہا کہ ہمارے آئین میں یہ واضح طور پر درج ہے کہ یہاں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں بن سکتا۔ دوسری طرف ہمارے مختلف مذہبی فرقوں کے مذہبی اختلافات اور فقہی تضادات کی یہ کیفیت ہے کہ ان کی موجودگی میں آئین کی مذکورہ شق کوئی مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتی کیونکہ اسلامی قوانین کے معاملہ میں ہر فرقے کی تعبیر الگ الگ ہے۔ صرف قرآن کریم ہی ایک کتاب ہے جس میں مذہبی اختلاف کو دخل نہیں۔ اور یہی وہ کتاب ہے جسے قانون سازی کے لئے بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسی شام گنٹونمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری اسکول میں پرویز صاحب نے ایک اجتماع عظیم سے خطاب کیا۔ خطاب کا عنوان تھا۔ اسلام میں عورت کا مقام۔ نیشنل اسمبلی کی رکن محترمہ بیگم زری سرفراز صاحبہ اس اجلاس کی صدارت کر رہی تھیں اپنے اہم خطاب میں محترم پرویز صاحب نے تاریخ کے اوراق الٹتے ہوئے بتایا کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر خود ساختہ مذہب نے عورت کو اس ادنیٰ ترین حد تک پہنچانے کی کوشش کی۔ جس کی مثال حیوانوں میں بھی موجود نہیں۔ اس کے بعد قرآن آیا اور اس نے اس مظلوم مخلوق کو پستیوں سے اٹھا کر انسانی مساوات کے اس ممتاز مقام پر فائز کر دیا جس کی مثال انسانی تاریخ میں کہیں موجود نہیں۔

اگلی صبح پرویز صاحب اپنے بعض رفقاء کی معیت میں عازم پشاور ہو گئے۔

پشاور کا دورہ ۔ ۲ اکتوبر دوپہر کے قریب پرویز صاحب چند احباب کے ساتھ راولپنڈی سے پشاور پہنچ گئے اور مرزا اعلیٰ احمد خاں صاحب کے ہاں فروکش ہوئے۔ اس علاقے کے ساتھ پرویز صاحب کے تعلقات ویسے بھی بڑے قدیمی ہیں تحریک پاکستان کے دوران وہ اکثر وہاں جاتے رہتے اور محترم صدر صاحب بخت جمال خاں کی معیت میں بڑا کام کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ جب بھی اس علاقے میں کسی مقام پر جاتے ہیں تو علاقہ بھر کے احباب جوق در جوق انہیں ملنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔ یہی سلسلہ اب کے بھی جاری رہا۔ اسی شام پرویز صاحب کی قیام گاہ پر پریس کانفرنس ہوئی۔ جس میں پرویز صاحب نے بتایا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان سیاسی ہنگاموں سے ہٹ کر یہ سوچیں کہ پاکستان کے اہم مسائل کیا ہیں۔

۳ اکتوبر کی شام پرویز صاحب وارسک تشریف لے گئے اور وہاں کمیونٹی سنٹر میں حاضرین سے غیر رسمی خطاب فرمایا۔ وارسک کے سائنٹفک ماحول کی رعایت سے ان کے موضوع کا عنوان ہی یہ تھا کہ "سائنس اور قرآن کا باہمی تعلق کیا ہے"۔

۴ اکتوبر کی شام محترم ضیاء صاحب کے مکان واقع جگن ناتھ پورہ میں پرویز صاحب کا عام خطاب تھا۔ جس میں شمولیت دعوت ناموں کے ذریعہ تھی تاکہ عام ہجوم کی بجائے پیغام منتخب تعلیم یافتہ طبقہ تک پہنچایا جا سکے۔ صدارت کے فرائض محترم خان بخت جمال خاں نے انجام دیے۔ ۵ اکتوبر کی سہ پہر پریس کانفرنس تھی جس کے بعد شام کے وقت ایک اجتماع میں موصوف نے سورۃ والعصر کی تفسیر اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمائی۔ ہفتہ کی صبح وہ بذریعہ ہوائی جہاز لاہور روانہ ہو گئے۔

تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے

جماعت اسلامی کی تخریبی کارروائیوں کے خلاف جو کچھ طلوع اسلام میں شائع ہوا ہے اس سلسلے میں ہمارے پاس اکثر استفسارات آرہے ہیں۔ ان میں ایک بات یہ بھی پوچھی جارہی ہے کہ جب پاکستان کے خلاف، مودودی صاحب کی مساعی، تحریک پاکستان کے دوران میں ہی شروع ہوگئی تھیں، تو کیا طلوع اسلام نے اس وقت انہیں اس سے متنبہ کیا تھا اور اُن کی اس مساعی کے خلاف کچھ لکھا تھا؟ اس کا جواب مثبت میں ہے۔ طلوع اسلام نے لکھا تھا۔ اور بروقت لکھا تھا۔ اس کی دو ایک مثالیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ یہ مضامین ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئے تھے۔ اس سے پہلے مودودی صاحب، متحدہ قومیت کے خلاف اور مسلمانوں کی الگ قومیت کے نظریہ کے حق میں بہت کچھ لکھ چکے تھے اس لئے طلوع اسلام کے دل میں ان کی بڑی قدر تھی۔ نیز اس وقت ابھی انہوں نے اپنی الگ پارٹی بھی نہیں بنائی تھی اس لئے ان کے مستقبل کے عزائم بھی نکھر کر سامنے نہیں آئے تھے۔ اس وقت ایسا ہی نظر آتا تھا کہ انہیں حصول پاکستان کی تگ وتاز کے سلسلے میں صرف طریق کار سے اختلاف ہے۔ اس لئے اس وقت طلوع اسلام میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک غلط فہمی میں مبتلا رفیق سفر سے، مشفقانہ نصیحت کے طور پر لکھا گیا تھا۔ جب اس کے بعد انہوں نے اپنی الگ جماعت بنالی اور زیادہ نکھر کر سامنے آئے تو ان کے عزائم واضح ہو گئے۔ یہ ان مضامین کی اشاعت کے بعد کی بات ہے۔

بہرحال ہم طلوع اسلام کی ۱۹۴۰ء کی فائل سے دو مضامین درج ذیل کرتے ہیں۔

پہلا مضمون، طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۴۰ء کے لمعات پر مشتمل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

(۱)

"جس قدر کسی قوم پر انحطاط ہوگا اسی قدر اس کی قوتِ عمل مفقود ہو جائے گی اور جوں جوں قوتِ عمل

کم ہوتی جائے گی۔ بیجا تنقید۔ بے معنی نکتہ چینی۔ اور نظری اعتراضات کا مادہ بڑھتا جائے گا۔ زندہ قوموں کی حالت اس سے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ وہ کامل غور و تدبر کے بعد اپنے نصب العین کو متعین کر کے راہِ عمل تجویز کر لیتی ہیں۔ اور اس کے بعد جوشِ کردار میں مست۔ این و آں سے بے خبر۔ والہانہ منزلِ مقصود کی طرف بڑھے جاتی ہیں۔ سلام کرنے والوں کو باتیں کرنے کی فرصت کہاں؟

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ہندوستان کے مسلمان کے بازو چونکہ عام طور پر قوتِ عمل سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس کے دماغ میں بے معنی نکتہ چینی کی عادت اسی اعتبار سے بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ ہمیں آئے دن اس قسم کے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں کہ تم لیگ جیسی جماعت کی حمایت کس طرح کرتے ہو جب کہ یہ عام طور پر ایسے افراد پر مشتمل ہے جن کی سیرت (بلکہ صورت بھی) مسلمانوں کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ ان کے دل جوشِ عمل سے عاری۔ ان کی نگاہیں بصیرتِ قرآنی سے محروم اور ان کے دماغ علومِ دین سے ناآشنا ہیں۔ ہم ان اعتراضات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے کیونکہ ہم اس سے پیشتر کئی مرتبہ واضح کر چکے ہیں کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہ کیوں ضروری ہے کہ وہ لیگ کی حمایت کریں۔ لیکن ان معترضین کی صف میں ہمیں بعض ایسے حضرات بھی ملتے ہیں جن کے خلوصِ نیت کے متعلق شبہ کی بہت کم گنجائش ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسموم فضا سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ جس میں اس قسم کے خیالات کو عام طور پر پھیلایا جاتا ہے۔ اس لئے ان کے اعتراضات بحث و جدال کی خاطر نہیں بلکہ طمانیتِ قلب کے لئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان حضرات کی تسکینِ خاطر کے پیشِ نظر ہم اس حقیقت کو آج پھر دہراتے ہیں جس کا اعادہ اس سے پیشتر کئی بار کیا جا چکا ہے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک عظیم الشان قافلہ تھا جو اپنی منزل متعین کر کے "حجاز" کی طرف چلا۔ راستہ میں اس نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ تھکے ماندے راہرو دستانے کے لئے لیٹ گئے۔ اٹھے تو ادھر ادھر نکل گئے کہ کچھ کھانے پینے کا سامان کریں۔ یوں ہی پھرتے پھرتے انہیں ایک طرف کنبھ کا میلہ دکھائی دیا۔ شوقِ تماشا میں ادھر لپک گئے۔ میلے کا ہجوم۔ تماشے گاجے گا شور۔ تفریح کا سامان۔ عیش و نشاط کی محفلیں۔ کچھ ایسے جذب ہوئے کہ یہ بھول ہی گئے کہ ہم کہاں سے آئے تھے اور کدھر جانا تھا۔ ایک سے ایک جدا ہو گیا۔ کوئی اس ٹولی میں جا ملا کوئی اس گروہ میں۔ اور یوں میلے کے ریلے میں ایسے بہ گئے جیسے سیلاب میں ایک پرکاہ۔ میلہ تھا یا تریوں

تھا۔ اُن کا رُخ تھا گنگا کی طرف۔ یہ بھی ان کے ساتھ اسی طرح بہنے لگے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انہی میں سے ایک راہرو کو خیال پیدا ہوا کہ ارے یہ کیا ہو گیا۔ ہمارے کا پورا قافلہ اپنی ہیئت قافلہ کو کھو کر میلے کی لہروں میں ریت کے ذروں کی طرح بہہ گیا۔ وہ میلے سے ہٹ کر ایک ٹیلے پر کھڑا ہو گیا۔ اور لگا زور زور سے چلانے کہ او بھائی قافلہ والو! سنو تو سہی! تم کہاں کھو گئے۔ ارے ادھر آؤ۔ ایک ایک کر کے اس میلہ سے باہر آ جاؤ اور یہاں جمع ہو جاؤ۔ قافلہ والوں میں سے اکثر نے کان کھڑے کئے۔ مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس آواز نے انھیں بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ واقعی قافلہ والوں کو یوں بکھر کر تو نہیں رہنا چاہیئے۔ روحیں سعید تھیں۔ فطرت کی آواز نے دل کو اپیل کیا۔ میلے کی جاذبیتوں میں الجھا ہوا دامن جھٹک کر باہر آ گئے۔ اور اس بلانے والے کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے سفر کی صعوبات کے مقابلہ میں میلہ کی طرب انگیز، تن آسانی کی زندگی کو ترجیح دی۔ ادھر یاتری بھی یہی چاہتے تھے کہ اہل قافلہ انہی میں گھل مل جائیں۔ انھوں نے بھی ان سے یہی کہا کہ دیکھو اس قدر جم غفیر کا ساتھ چھوڑ کر ایسی پُر لطف محفلوں کو خیرباد کہہ کر جن میں تمہیں نہ کمانے کی فکر نہ پکانے کی۔ پھر وہی صحرا نوردی۔ اور دشت پیمائی۔ وہی غربت و افلاس کی زندگی اختیار کر لینا کہاں کی دانش مندی ہے۔ مقصد تو محض "اشنان" ہے۔ زمزم میں نہ کیا گنگا میں کر لیا۔ جس خدا کا وہاں پانی ہے اسی کا یہاں بھی ہے۔ ادھر گنے کو سمیٹنے کا بہانہ۔ یہ میلے والوں کے ساتھ ہی بڑھتے گئے۔ انھوں نے کہا کہ دیکھو! تمہارے ساتھی کدھر جا رہے ہیں۔ انھیں بھی سمجھاؤ کہ تمہارے ساتھ ہی رہیں۔ چنانچہ انھوں نے ادھر سے چلانا شروع کر دیا کہ ارے ادھر نہ جانا۔ کیا پہلی مصیبتیں بھول گئے؟

بدبختی یہ کہ ہیئتِ قافلہ کی طرف بلانے والے کے نہ داڑھی تھی نہ جُبّہ اور عمامہ۔ اور دوسری طرف آواز دینے والوں کی شکل و صورت تھی خیر سے متشرع اور کمر پر کتابوں کا بوجھ۔ اب کہئے کہ بکھرے ہوئے قافلہ کے افراد محض اس لئے یاترا والوں کے طرفداروں کی جانب چلے جائیں کہ دوسری طرف کا آواز دینے والا "مولوی صاحب" نہیں ہے۔ یا اتفاق سے جو لوگ پہلے اس کے گرد جمع ہو چکے ہیں وہ قافلہ کے کن افراد میں سے ہیں۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ اس وقت ان وہ لوگ آوازوں میں حق کی آواز اس طرف سے آ رہی ہے جو اس منتشر قافلہ کے کھوئے ہوئے افراد کو پھر سے ہیئت قافلہ کی تشکیل کی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے ہر وہ شخص جو اس وقت اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اس کی آواز کو بلند کرے گا وہ قافلہ والوں کا حقیقی بہی خواہ ہے۔ ہم اس آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہیں تاکہ یہ آواز اس قدر بلند ہو جائے کہ قافلے کے ایک ایک راہرو کے کان تک پہنچ جائے۔

اس افراتفری کے عالم میں۔ اس تشتت و انتشار کی حالت میں جس میں یہ بکھرا ہوا کارواں مبتلا ہے، قطعاً اس کی فرصت نہیں۔ اور نہ ہی ضرورت کہ ہم اس کا مواز نہ کریں کہ دونوں اطراف کے داعیوں میں سے کس کی شکل و صورت مسلمانوں کے آئینے میں صحیح اترتی ہے۔ قافلہ کے تمام افراد کو یکجا جمع ہونے دیجئے۔ ان کی گم گشتہ ہیئت قافلیہ کی پھر سے ترتیب ہو جائے۔ اس کے بعد اس امر کا بھی فیصلہ کر لیا جائے گا۔

پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو میلے سے تو باہر ہیں لیکن ایک طرف الگ کھڑے ہر ادھر آنے والے کے کان میں کہہ دیتے ہیں کہ دیکھنا! اس کی طرف نہ جانا۔ وہ تمہیں حجاز کے بجائے "ترکستان" کی طرف لے جائے گا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اس چیز کے فیصلہ کا وقت بھی ابھی نہیں آیا کہ یہ داعی اس قافلہ کو کدھر لے جائے گا۔ یہاں تو ابھی قافلہ کا وجود ہی غائب ہے۔ راستے کے تعین کا سوال تو بعد کی چیز ہے۔ فرض کر لیجئے کہ آپ کے شکوک بجا ہیں۔ لیکن قافلہ جمع ہو جانے میں کیا حرج ہے؟ جب قافلہ کے تمام افراد یکجا ہو جائیں گے۔ اس وقت یہ بھی فیصلہ کر لیجئے گا کہ اب اس کا رُخ کدھر کو ہونا چاہیئے۔

یہ بھی تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ یہ صاحب اس قافلے کو ترکستان کی طرف لے جائیں گے لیکن اس صورت میں بھی صحیح راہ صواب یہی ہوگی کہ آپ اس قافلے کے ساتھ رہیئے۔ قافلہ کو چلتا جانے دیجئے۔ اور آپ راہروؤں کو تہلتے جایئے کہ دیکھو بھائی! یہ راستہ حجاز کی طرف نہیں جا رہا۔ دیکھتے نہیں ہو حجاز کے راستے میں اس قسم کے کھنڈرات کہاں آئے تھے؟ وہاں اس قسم کی جھاڑیاں کہاں تھیں؟ یہ آموں کے باغ عرب کی زمین میں نہیں ہو سکتے۔ یقین مانئے کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ان قافلہ والوں کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ واقعی یہ میر کارواں انھیں سیدھے راستے پر نہیں لے جا رہا۔ اس لئے کہ

کم کوشش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی!

اس وقت اگر میر کارواں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو بالا وہ خود سیدھے راستے پر آ جائے گا یا قافلہ کی قیادت راہ شناس لوگوں کے سپرد کر دے گا۔ اگر وہ خود ایسا نہ کرے گا تو قافلہ والے اسے مجبور کریں گے کہ وہ ایسا کرے اس وقت آپ شوق سے زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیجئے گا۔

لہٰذا سب سے پہلی چیز تو ہیئت قافلیہ کی ازسرِ نو ترتیب و تشکیل ہے۔ باقی باتیں بعد کی ہیں۔ ہمارا منتہائے

نگاہ بھی حکومت الٰہیہ کا قیام ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ اس نظام حکومت کے پرزے وہی لوگ ہو سکیں گے جن کی سیرت و کردار قرآنی معیار پر پورے اُتریں گے۔ لیکن اس وقت تو صرف ایک مقصد پیش نظر ہے اور وہ یہ کہ قافلہ کے کھوئے ہوئے افراد کو کسی نہ کسی طرح پھر سے قافلہ کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس لئے ہمارے نزدیک ہر وہ شخص جو اس مقصد کے حصول کی تائید کرتا ہے، حق کا ساتھ دیتا ہے۔ اور جو ایسا ہونے میں کسی نہج سے بھی مانع ہے۔ ملت کا بہی خواہ نہیں ہے۔ خواہ اس کا یہ طرز عمل نفسانیت پر مبنی ہو یا اس کی قوت فیصلہ کی غلطی پر۔ ملت کے لئے نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔

اس مقام پر ایک بات اور بھی سامنے رکھنی چاہیئے۔ ہمارے اس قسم کے مدعیان اصلاح ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ "مسلمانوں کی جماعت" بھلانے کا اس کو حق ہے جو جماعت خالصتہً قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو اور ان کی قیادت صرف اس کے لئے سزاوار ہے جو عمر فاروقؓ کا ثانی ہو۔

بلاشک و شبہ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اور ہمارا بھی یہی ایمان ہے کہ مسلمانوں کو معراجِ کمال تک پہنچنے کے لئے اپنے سامنے ایک ہی نمونہ رکھنا چاہیئے اور وہ نمونہ ہے "محمد رسول اللہ والذین معہ" کا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ آج مسلمان جس "دورِ جاہلیت" کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ کیا آپ توقع کر سکتے ہیں کہ پہلی ہی جست میں یہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے مشابہ ہو جائے گا؟ اسے یہ تمام مراحل بتدریج طے کرنے ہوں گے۔ اور جس قسم کا تمثیلی مسلمان اسے ہونا چاہیئے اس سطح تک پہنچنے کے لئے اسے مختلف ادوار سے گزرنا ہوگا۔ پہلا قدم اٹھانے کے بعد تو آپ ان کی حیاتِ جاہلیہ اور حیاتِ اسلامیہ میں حدِ فاصل بھی بمشکل قائم کر سکیں گے۔ پھر ایک نبی کی تو یہ شان ہوتی ہے کہ وہ اپنی تربیت عالیہ سے ان مراحل کو برق رفتاری سے طے کرا دے۔ لیکن وہ مصلحین قوم جو خود اسی قوم میں سے ہوں گے وہ تو ایسا معجزہ نہیں دکھا سکتے۔ رات کو آپ کی قوم "عہدِ جاہلیہ" کی زندگی میں سوئے اور صبح اٹھے تو قوم جنگِ قادسیہ کے مجاہدین کی مثل بن جائے۔ اور ان کا امیر عمر فاروقؓ کا ثانی۔

اس قسم کی نظری تعلیم سے ایک سخت نقصان یہ پہنچ رہا ہے کہ قوم کا نوجوان طبقہ اپنے اندر ضبط و انضباط (DISCIPLINE) اور جذبۂ اطاعت پیدا کرنے کے بجائے از سرِ تا قدم مجسم تنقید بن جاتا ہے۔ اور وہ اپنے نظریات کی جنتِ خیال میں ایسا گم ہوتا ہے کہ تمام انسان اس کی نگاہ میں عالمِ سفلی کے باشندے بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ نہ خود کچھ کرتا ہے نہ کسی کے کئے ہوئے کو خاطر میں لاتا ہے۔ اور یوں قوم کا وہ عنصر جسے ملت کے بازوؤں کی زندہ قوت بننا چاہیئے تھا۔ طلسم ہوشربا کے افسانہ کا ہیرو بن کے رہ جاتا ہے۔

(۲)

دوسرا مضمون طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۴۰ء کے لمعات پر مشتمل ہے۔

زمانہ کے تلاطم کے ہاتھوں جب ہندی مسلمانوں میں کچھ سیاسی شعور کے آثار نمایاں ہونے لگے تو ادھر اُدھر سے مخالف قوتوں کے کان کھڑے ہوئے۔ ملوکیت کا طاغوت اکبر اپنی پوری قہرمانی قوتوں کے ساتھ ایک طرف اسباطِ حکومت پر انگریز کی جانشینی کے منصوبے باندھنے والا ہندو دوسری طرف' یہی دو قوتیں کم نہ تھیں کہ ہندو سیاست کے آلہ کار مسلم قومیت پرستوں کا گروہ آگے بڑھ آیا۔ اور ملتِ اسلامیہ کی قوتوں کا بیشتر حصہ انہی کی مدافعت کی نذر ہوگیا۔ آپ مسلمانوں کی گزشتہ چند سال کی جد وجہد پر نگاہ ڈالئے نظر آجائے گا کہ اس سعی وعمل کا معتدبہ حصہ ان بکھیڑوں کو سلجھانے میں صرف ہوگیا۔ جو ان قومیت پرست حضرات کی وجہ سے پیدا کئے گئے تھے۔ ہندو مسلم ایک قوم ہیں یا دو الگ الگ قومیں۔ ہندو اکثریت کی حکومت مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہوسکتی ہے یا نہیں۔ مسلمانوں کی تہذیب ومعاشرت ہندوؤں سے الگ ہے یا نہیں۔ مذہب اسلام کو سیاست سے تعلق ہے یا نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ غور فرمائیے کہ اگر یہ چند نام نہاد مسلمان ہندو سیاست کے مہرے نہ بن جاتے تو ان میں سے کوئی مسئلہ بھی ایسا تھا جس کے اثبات کے لئے ذرہ برابر بھی کوشش کی ضرورت پڑتی؟ یہ وہ مسلمات تھے جن میں کبھی کہیں اختلاف پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی کسی اختلاف کی گنجائش تھی۔ یہ تو ہندو سیاست کی شاطرانہ چالیں تھیں کہ انہوں نے چند ایسے مسلمان ساتھ ملا لئے جنہوں نے اس مسائل کو متنازعہ فیہ بنا کر آگے بڑھایا اور مسلمانوں کی وہ قوتیں جو مخالفین کے مقابلہ میں صرف ہونی تھیں۔ ان پیدا کردہ مباحث کے تصفیہ میں ضائع ہوگئیں۔ "ضائع" اس لئے کہ اگر یہ نیشنلسٹ حضرات ہندوؤں کے آلہ کار نہ بنتے تو نہ یہ مباحث پیدا ہوتے نہ ان کے حل کے لئے کسی کو کوشش کی ضرورت پڑتی بہرحال ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ — خدا سے کیا ستم وجور ناخدا کہئے

وہ دور قریب قریب گزر گیا۔ اللہ تعالیٰ مسٹر جناح کی عمر اور ہمت میں برکت عطا فرمائے کہ ان کی عزم راسخ اور سعی پیہم سے راستہ کی یہ تمام خاردار جھاڑیاں ایک ایک کرکے اکھڑ گئیں اور ایک دنیا نے دیکھ لیا کہ قومیت پرستوں کے یہ شاخسانے ہندو دامِ سیاست کے حلقوں کے سوا کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

لیکن ہماری بدقسمتی کی داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اب مسلمانوں میں ایک اور گروہ پیدا ہو رہا ہے جن کی سعی و عمل کی نوعیت اور رنگ روپ کا دائرہ قومیت پرستوں سے الگ ہے۔ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے ان سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ جس زمانہ میں وہ متنازعہ فیہ مسائل معرض بحث میں تھے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے تو یہ حضرات قومیت پرستوں کے مخالف تھے۔ انھوں نے اپنی پوری کوشش قومیت پرستوں کے دعاوی کی تردید میں صرف کی یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک متحدہ قوم نہیں بن سکتے۔ مغربی انداز جمہوریت مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں۔ مسلمان ایک جداگانہ تہذیب اور تمدن کا حامل ہے۔ اس کا مذہب سیاست سے الگ نہیں ہو سکتا۔ وغیر ذالک ان حضرات کی آواز جمہور مسلمانوں کی آواز سے ہم آہنگ رہی اور اس طرح انھیں ساتھ ساتھ مقبولیت بھی حاصل ہوتی چلی گئی۔ لیکن جب یہ دور ختم ہونے کو آیا تو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں ایک الگ گروہ سازی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ اور اسی کے لئے اس نظریہ کی تبلیغ ہو رہی ہے کہ جو کچھ قومیت پرست مسلمانوں کی طرف سے پیش ہو رہا ہے وہ بھی غلط۔ اور جو کچھ جمہور مسلمان (یا یوں کہئے کہ مسلم لیگ) کی طرف سے کوشش ہو رہی ہے۔ وہ بھی باطل سے

جرم او از سجدۂ تقصیر ما از دانش!
نہ یاں بیچارہ می سازی۔ نہ با ما ساختی

ان حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے اتحاد۔ مرکزیت۔ تنظیم۔ اطاعت۔ حصول حکومت وغیرہ کی جتنی کوششیں ہو رہی ہیں سب غیر اسلامی ہیں۔ نہ یہ مسلمان ——— نہ ان کی جدوجہد اسلامی۔ یہ سب اس قابل ہیں کہ انھیں جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ اور ان کی سعی و عمل ایسی کہ انہیں نذر آتش کر دیا جائے۔ اس کی تفصیل انہی کے الفاظ میں سنئے۔

> ان کے لیڈر (جمہور مسلمانوں کے) نزدیک پیش نظر مسئلہ کی نوعیت بس یہ ہے کہ مسلمان کے نام سے ایک قوم بن گئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں حکومت آ جائے۔ یا کم از کم اس کو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے یہ جتنا بھی دماغ پر زور ڈالتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی طریق کار انہیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قومیں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لئے بھی اختیار کی جائیں۔ جن اجزاء سے یہ قوم مرکب ہے ان کو جوڑ کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے۔ ان میں نیشنلزم کا جوش پھونکا جائے۔ ان کے اندر مرکزی اقتدار ہو۔ ان کے نیشنل گارڈ منظم ہوں۔ ان کی ایک قومی ملیشیا تیار ہو۔ وہ جہاں

اکثریت میں ہوں وہاں اقتدار اکثریت (MAJORITY RULE) کے مسلم جمہوری اصول پر ان کے قومی اسٹیٹ بن جائیں۔ اور جہاں ان کی تعداد کم ہو وہاں ان کے حقوق کا تحفظ ہو جائے۔ ان کی انفرادیت اسی طرح محفوظ جس طرح دنیا کے ہر ملک میں ہر قومی اقلیت (NATIONAL MINORITY) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے۔ ملازمتوں اور تعلیمی اور انتخابی ادارت میں ان کا حصہ مقرر ہو۔ اپنے نمائندے یہ خود چنیں۔ وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کئے جائیں۔ وغیرذالک من القومیات۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امت جماعت ملت۔ ملیت۔ امیر اطاعت امیر۔ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لے کر بولتے ہیں۔ مگر اساسی فکر کے اعتبار سے یہ سب ان کے لئے مذہب قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں۔ جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑائے مل گئے۔ اور غیر اسلامی فکر کو چھپانے کے لئے اسلامی رنگ کے غلاف کا کام دینے لگے۔ اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپ کو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئے گی کہ اس کی بنا رکھنے کے لئے یہ طرز فکر یہ انداز تحریک یہ عملی پروگرام نقطۂ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتے۔ کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کا ہر جز ایک تیشہ ہے جس سے اسلامی حکومت کے تخیل کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ہے۔

ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام دردوں کی دوا ہے۔ "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی یہ سبیل سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں۔ متحد ہوں۔ اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لئے جد وجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کرے گی۔ خواہ وہ ہندو قوم ہو یا سکھ۔ یا جرمن یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس

میں حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو۔ ہر قوم کی سربلندی کے لئے مفید ہوتا ہے۔ خواہ وہ مونجے ہوں یا ساورکر یا ہٹلر یا مسولینی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لئے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں۔ ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ وہ جاپانیت پر ایمان رکھتے ہیں یا چینیت پر۔ پس اگر مسلمان ایک نسلی و تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیش نظر مقصد صرف اس کا بول بالا کرنا ہے تو اس کے لئے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک قومی حکومت بھی میسر آسکتی ہے اور بدرجۂ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصہ حصہ بھی مل سکتا ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت تک پہنچنے کے لئے یہ پہلا قدم بھی نہیں۔ بلکہ الٹا قدم ہے۔ یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا۔ یا فوجی تربیت سے ان میں بھیڑیئے کی درندگی پیدا کرنا جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لئے تو ضرور مفید ہو سکتا ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلاء کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ کون ان کی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا؟ کس کی نگاہیں ان کے سامنے عزت سے جھکیں گی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لئے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کہاں ان کے انفاس قدسیہ سے یدخلون فی دین اللہ افواجا کا منظر دکھائی دے سکے گا؟ کس جگہ ان کی روحانی امامت کا سکہ جمے گا؟ اور زمین پر بسنے والے کہاں ان کا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کریں گے؟ اعلاء کلمۃ الحق جس چیز کا نام ہے اس کے لئے تو صرف ان کارکنوں کی ضرورت ہے۔ جو خدا سے ڈرنے والے اور حدود اللہ کے قانون پر فائدہ و نقصان کی پروا کئے بغیر جمنے والے ہوں۔ خواہ وہ اس نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی ہو کر آئیں۔"

ہم نے ان حضرات کی روش کو قومیت پرستوں کے مسلک سے زیادہ خطرناک اس لئے کہا ہے کہ قومیت پرستوں کے دعاوی کی کمزوری تو بداہتہً نظر آجاتی تھی اور تھوڑی سی کوشش سے عوام کو ان کے دام فریب سے آگاہ کیا

جا سکتا تھا۔ لیکن جو نصب العین یہ حضرات پیش کر رہے ہیں ان کے صحیح اور خالص اسلامی ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی اس بنا پر مخالفت کی جا سکتی ہے۔ اس لئے جو شیلے نوجوانوں کا جو بالعموم جذبات کی ہر رَو میں بہ جانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ان کے ساتھ ہو جانا کچھ مستبعد نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ نصب العین اسلامی ہے تو پھر اس سے خطرہ کیا ہے؟ یہ سوال جتنا اہم ہے اتنا ہی نازک بھی ہے اس لئے اس کی اہمیت و نزاکت کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر بدقت نظر غور کیا جائے۔

ہم نے اس سوال کے متعلق ضمناً سال گزشتہ بھی کچھ لکھا تھا اور اس وقت جو کچھ گزارش کیا جائے گا اسے انہی اشارات کی اجمالی تفصیل سمجھئے۔ سب سے پہلے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یہ دیکھ لیجئے کہ مسلمانوں کی سیاست کے متعلق ہمارا نظریہ کیا ہے۔ ہمارا نظریہ۔ نظریہ نہیں بلکہ ایمان ہے کہ۔

(۱) مسلمان دنیا میں اللہ کے سوا کسی کا محکوم نہیں ہو سکتا۔ حکومت اس کی اپنی ہونی چاہئے۔

(۲) اس کی اپنی حکومت سے مراد ان انسانوں کی حکومت نہیں جو اپنا نام مسلمان رکھتے ہوں۔ بلکہ ان کے خدا کی حکومت ہے۔ یعنی خدا کے ضابطۂ قوانین۔ قرآن کریم کی تنفیذ و ترویج۔ اسی کے مطابق امر و نہی۔

(۳) اس حکومت کا قیام و بقا ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہو سکے گا جن کی سیرت خالص اسلامی قالب میں ڈھلی ہو۔ غیر اسلامی فکر و نظر کے لئے اس میں کہیں کوئی گنجائش نہیں۔

ہمارا یہ ایمان آج کا نہیں۔ بلکہ جس دن سے طلوعِ اسلام شہود پر آیا ہے۔ ہم اپنے اس ایمان کا اعلان کرتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا اس باب میں ہمارا اور ہمارے پیش نظر حضرات کا کچھ اختلاف نہیں۔ اختلاف ہے تو اس نصب العین تک پہنچنے کے وسائل و طریق کا۔ اختلاف منزل کا نہیں۔ رہگذر کا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اختلاف ایسا ہے کہ ان حضرات کی پرورش فی الواقعہ خطرناک نتائج پیدا کرنے کی موجب ہو جائے گی اس لئے ہم اس اختلافِ راہ کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہمیں ان حضرات کی حسنِ نیت کے متعلق کسی شبہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن سکھیا خواہ دشمن کی حیثیت سے دانستہ دیا جائے۔ خواہ دوست کی حیثیت سے نادانستہ۔ اس کا نتیجہ تو ایک ہی ہو گا۔ اس لئے ہمارے نزدیک ان حضرات کی "نادان دوستی" قوم کے حق میں ویسی ہی ہلاکت آفریں ہے۔ جیسے مخالفین کی "دانا دشمنی"۔ قوموں کے عیوب و اسقام کو بالعموم دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بعض عیوب مفلسی۔ محکومیت۔ کمزوری اور پراگندگی کی بنا پر ہوتے ہیں اور بعض دولت۔ حکومت۔ قوت اور جتھہ بازی کی وجہ سے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوت و دولت کے پیدا کردہ عیوب عالم انسانیت میں وہ فساد برپا کر دیتے ہیں جن میں

آج یورپ اور اس کے وابستگانِ دامن بُری طرح مبتلا ہیں۔ لیکن کمزوری اور مفلسی سے پیدا شدہ عیوب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے کچھ کم انسانیت سوز نہیں ہوتے۔ ہندوستان کے مسلمان جس دورِ انحطاط سے گزر رہے ہیں ظاہر ہے کہ ان میں وہ تمام عیوب موجود ہیں جو ایک کمزور گری ہوئی قوم میں ہونے چاہئیں۔ اس وقت مُصلحین ملت (یا یوں سمجھئے کہ مسٹر جناح اور ان کے مؤیدین) کی تمام توجہات اس نقطہ پر مرکوز ہیں کہ قوم سے کمزوری اور پراگندگی کو دور کیا جائے تاکہ ان سے پیدا شدہ عیوب و نقائص دور ہو جائیں۔

ہمارے یہ معترضین حضرات جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں۔ چونکہ قوم کی جو اخلاقی حالت آج ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ قوت آ جانے کے بعد ان میں وہی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ جو دوسری قوموں میں ہوئی ہیں۔ اس لئے ہر وہ کوشش جو ان میں قوت تنظیم پیدا کرنے کے لئے صرف کی جا رہی ہے' مردود و ملعون ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ اگر قوت کو ضابطۂ الٰہی کے تحت نہ رکھا جائے تو اس سے فساد برپا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس خوف سے قوت پیدا کرنے کے خیال کو باطل اور اس کی کوششوں کو مستحق نفرین قرار دینا کہاں کی دانش اطواری ہے۔ کوشش یہ کیجئے کہ قوت آ جانے کے بعد ان میں خرابیاں نہ پیدا ہوں۔ اس قسم کی کوششوں سے آپ کو کون روکتا ہے لیکن یہ کوشش قوم کے ساتھ رہ کر ایک طبیبِ مشفق کی حیثیت سے بروئے کار آسکتی ہیں۔ الگ کھڑے ہو کر قوم کو کوسنے سے کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔

پھر ذرا اس چیز پر بھی غور کیجئے کہ قوم اس وقت ہندی سیاست کی کس کشمکش میں مبتلا ہے۔ ہندوؤں کی پوری قوتیں اس امر کے لئے صرف ہو رہی ہیں کہ مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو فنا کر دیا جائے اور جس طرح اور بیسیوں قومیں ہندوؤں میں جذب ہو کر اپنی ہستی کو ہمیشہ کے لئے کھو چکی ہیں۔ مسلمانوں سے بھی یہی کچھ کیا جائے۔ ہمارے ان معترضین کا خیال ہے کہ اس سے مسلمانوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ جب ہندوستان کے مسلمان۔ مسلمان ہی نہیں تو ان کے رہنے سے کیا فائدہ ہے۔ جو ان کے مٹنے سے افسوس ہوگا۔ یعنی ان کا نظریہ یہ ہے کہ جس مریض کے قویٰ اس قابل نہ رہے ہوں کہ وہ صحت یاب ہو کر میدان جنگ میں لڑ سکے اس کے علاج کی کوشش بیکار ہے۔ بہتر ہے کہ اسے انجکشن دے کر ہلاک کر دیا جائے۔ اس کے برعکس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی صحت یابی کے لئے کوشش کیجئے۔ میدان جنگ میں لڑنے کے قابل نہ بھی ہو سکے گا تو ایک کنبہ کی پرورش کا کفیل تو ہو گا۔ کیا عجب کہ اس کے پرورش کردہ کنبہ میں سے وہ بچے پیدا ہوں جو آگے جا کر سپاہی ہی نہیں بلکہ جرنیل بن جائیں۔ یہ حضرات خود اپنی حالت پہ غور فرمالیں۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ ان حضرات کے معیار کے مطابق آج نہ مسٹر جناح مسلمان ہے نہ ہندوستان کے باقی مسلمان۔ لیکن بہر حال یہ خود تو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں۔ اب سوچئے کہ اگر آج سے پچاس سال پیشتر انہی حضرات جیسے کچھ مسلمان پیدا ہو جاتے جن کا نظریہ

یہ ہوتا کہ مسلمان اگر مٹتے ہیں تو مٹنے دیجئے۔ اگر ہندو انہیں اپنے اندر جذب کرتے ہیں تو کرنے دیجئے۔ اس سے نقصان کیا پہنچتا ہے تو آج ہمارے یہ معززین حضرات دھوتی باندھے، زنار پہنے، ماتھے پر سیندور کا ٹریڈ مارک لگائے اجودھیا کے کنڈے پر مہادیو کی مورتی کو ڈنڈوت کرتے نظر آتے۔ وہ پچاس برس پہلے کے مسلمان۔ ان کے معیار کے مطابق ہزار "نامسلمان" سہی۔ ان کے نام نہاد مسلمان رہنے سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ ان کی اولاد سے آج یہ سچے مسلمان پیدا ہو گئے۔ وہ (خدانکردہ) مٹ جاتے۔ تو آج یہ کہاں سے پیدا ہوتے۔ ذرا سوچئے کہ اسپین سے مسلمان حرف مکرر کی طرح مٹ گئے۔ وہاں آج مسلمانوں کی قبروں تک کے نشان باقی نہ رہے اور ہندوستان کے نام نہاد مسلمان باقی رہ گئے ہیں تو ان کے صدقے آج آپ جیسے بلند نظر مسلمان پیدا ہو گئے۔ اسی طرح اگر آج ہندوستان کے مسلمانوں کا اسپین کا سا حشر ہو جائے تو کل کو آپ جیسے کہاں سے پیدا ہوں گے۔ یعنی وہ لوگ جن کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ

"جیسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا حکم بلند کیا تھا۔ ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے"۔ اللہ کا حکم بلند کرنے کے مدعی آج اس لئے موجود ہیں کہ پہلے "نام نہاد مسلمان" مٹے نہیں تھے۔ لہٰذا آج کے نام نہاد مسلمانوں کے مٹانے کی فکر نہ کیجئے۔ مٹانے کی فکر کرنے والے اور بہت ہیں۔ ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

پھر ارشاد ہے۔

"بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاست اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو معجزہ سمجھوں گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر نہیں کیا جا سکتا۔"

ان حضرات کی بنیادی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں تغیر واقع ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ان کی کوششیں صحیح نتائج کی مثمر ہوں گی۔ اس میں کسے کلام ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن نامساعد حالات سے قوم آج دوچار ہے۔ اس میں اس قسم کے اجتماعی انقلاب کی آپ کو اجازت بھی مل سکتی ہے؟ اجازت کے سوال کو چھوڑیئے آپ کہہ دیں گے کہ ہمیں حکومت کی مزاحمت کے باوجود ایسا کرنا ہوگا۔ لیکن کیا آپ کے پاس اس قسم کے انقلاب کے

لئے وسائل و ذرائع بھی ہیں۔ حالت آج یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک آپ کا ایک ایک بال غیروں کی غلامی کے آہنی شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک طرف اگر حکومت کی قانونی غلامی ہے تو دوسری طرف ہندو کی اقتصادی غلامی۔ جو قوم اس قسم کی دوہری لعنت میں گرفتار ہو ان میں ایسے اجتماعی انقلاب کی توقع رکھنا کہ وہ ایک ہی چکر میں محمد رسول اللہ والذین معہ کے قدوسی پیکر میں تبدیل ہو جائیں گی بہت زیادہ خوش فہمی ہے۔ اور خوش فہمی ہی کیا۔ کھلا ہوا تضاد ہے۔ ایک طرف خود یہ حضرات قوم سے اس قدر مایوس ہیں کہ اس کے مٹ جانے کا انہیں ذرا بھی رنج نہیں ہوتا۔ اور دوسری طرف ایسے متفاؤل کہ ان سے ایسے تغیر انگیز انقلاب کے متوقع۔ بہرحال آج قوم کی جو حالت ہے وہ ظاہر ہے اگر اسے اپنی حکومت نصیب ہو جائے تو آج سے تو حالت اچھی ہوگی۔ انگریز کی آہنی غلامی اور ہندو کی اقتصادی غلامی تو نہ ہوگی۔ آپ کہہ دیں گے کہ اس وقت خود اپنوں کا استبداد ایسا ہوگا کہ جو مشکل آج ہے وہی اس وقت ہوگی۔ سو اول تو یہ مفروضہ غلط ہے۔ دوسروں کی غلامی کے مقابلہ میں اپنی حکومت میں انقلاب کے لئے حالات کہیں زیادہ سازگار ہوتے ہیں۔ ترکی اور ایران کے انقلاب کو دیکھئے اور اس کے مقابلہ میں مثلاً شام اور مراکش کے مسلمانوں کی حالت پر غور کیجئے۔ وہاں اپنی حکومت تھی۔ لیکن نسبتاً آسانی سے پیدا ہو گیا۔ (یہ الگ بات ہے کہ وہ تغیر کیسا تھا۔) شام اور مراکش میں غیروں کی حکومت ہے۔ وہاں انقلاب ایسا آسان نہیں۔ علاوہ ازیں اس چیز کو بھی سامنے رکھئے کہ ابھی اپنوں کے استبداد کا "شکنجہ" وجود میں نہیں آیا۔ ابھی تو اپنی حکومت کے حصول کے لئے جدوجہد ہو رہی ہے۔ ادھر یہ جدوجہد جاری ہے اس کے ساتھ ساتھ آپ جہاں تک حالات سازگار ہوتے جائیں۔ اس اجتماعی انقلاب کی بھی کوشش کرتے جائیے جو آپ کے ذہن میں ہے۔ جب اپنی حکومت کے آثار نمایاں ہوں گے اس اجتماعی انقلاب کی بھی داغ بیل پڑ چکی ہوگی۔ یہ ہے صحیح طریق کار۔

اب آخر میں یہ دیکھئے کہ ان حضرات کی اس تخریبی روش سے قوم کو کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے۔ خدا خدا کر کے مسلمانوں کے سامنے یہ چیزیں آنے لگی تھیں کہ تشتت و افتراق کی زندگی لعنتی زندگی ہے۔ مفلسی۔ ناداری یکسی بے بسی کمزوری کی زندگی انسانیت کی زندگی نہیں۔ انہیں اپنی تنظیم کرنی چاہیئے۔ اپنے اندر اطاعت شعاری اور قربانی کا مادہ پیدا کرنا چاہیئے۔ وغیرہ ذالک۔ لیکن ان حضرات نے ادھر سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تمام کوششیں غیر اسلامی اور ان کے علم بردار جہنم میں دھکیل دینے کے قابل ہیں۔ نتیجہ یہ کہ قوم کا وہ فعال عنصر جسے ساتھ لے کر کچھ کام کرنا تھا۔ عضو معطل ہو کر بیٹھ گیا۔ قوم کے نوجوان بجائے اس کے کہ کچھ کام کریں سر سے پاؤں تک تنقید بن گئے۔ جس قوم

کے معیاری مسلمان ہمارے نوجوان خود ہیں اس کا ہمیں بھی علم ہے اور ہمارے ان معترض حضرات کو بھی۔ لیکن ان نوجوانوں کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ قوم کے ہر فرد کو ذلیل اور قابلِ نفرت سمجھنے لگ گئے ہیں۔ انہیں جب دیکھئے استحقار کی خفیف سی ہنسی ان کے لبوں پر اور نفرت کے شکن ان کی پیشانی پر ہوں گے اور یہ سب کچھ اس لئے کہ کوئی شخص اس آئیڈیل (نظری نصب العین) پر پورا نہیں اترتا جو ان کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ نوجوانوں کے سامنے صحیح اسلامی نصب العین رکھنا بیشک ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بتانا بھی نہایت ضروری ہے کہ "عہد جاہلیت" کے جس دور سے ہم آج گزر رہے ہیں۔ کام کرنے والوں کو اس کا الاؤنس (ALLOWANCE) دینا بھی ضروری ہے۔ ہمیں ایک مرتبہ ایک اسی قسم کے نظری نوجوان سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ کچھ اس قسم کے "عالم بالا" کی باتیں کر رہا تھا۔ "اقبال"؟ اقبال نے کیا کیا؟ ایک بے عمل فلسفی تھا؟ اور انسانوں کی دنیا میں رہنے والا شاعر! جناح؟ لاحول ولا۔ سر سے پاؤں تک افرنگ زدہ۔ ٹوڈی۔ اس سے کیا ہو سکے گا۔ اگر انقلاب برپا ہوگا تو اسی شمشیر کے زور سے ہوگا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار بھی تھی جس کے بوجھ سے غریب کی کمر میں تین بل پڑے ہوئے تھے۔ دوسرے دن ہم نے دیکھا کہ ملت اسلامیہ کے یہ انقلاب آفریں مجاہد اس فکر میں تھے کہ تلوار کس کے حوالہ کریں۔ کیونکہ انہیں پنجاب سے باہر ایک ایسی جگہ جانا تھا جہاں تلوار پر الائنس تھا۔ یہ ہے وہ خرابی جو اس نظری تعلیم نے پیدا کر دی ہے جس میں تخریب ہی تخریب ہے۔ تعمیر کی کوئی شکل سامنے نہیں اور اس کا ثبوت بالکل ظاہر ہے۔ خود ان حضرات کو تسلیم ہے کہ متحدہ قومیت اور اس قبیل کے دوسرے شاخسانے جو قومیت پرست مسلمانوں نے پیدا کر رکھے ہیں ملت اسلامیہ کے حق میں بڑے مہلک جراثیم کے حامل ہیں اب گزشتہ دو تین سال کی سیاسی کشمکش کو دیکھئے۔ مسٹر جناح جو ان حضرات کے نزدیک کسی صورت میں بھی مسلمان سمجھے جانے کے مستحق نہیں۔ اس دوران میں دن رات کی ان تھک محنت سے قومیت پرستوں کے اس جال کا ایک ایک حلقہ تارِ عنکبوت کی طرح توڑ کر رکھ دیا۔ اس کے برعکس یہ حضرات جنھیں یہ دعویٰ ہے کہ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا۔ ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے۔ اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کئے سے ہو سکتا ہے وہ ذرا اپنی جد و جہد کے نتائج پر بھی غور کریں۔ وہ آج تک چار مسلمان بھی اپنے ساتھ ایسے نہیں ملا سکے یا اپنی تعلیم و تربیت سے پیدا نہیں کر سکے جو ان کے معیارِ اسلامی پر پورے اترتے ہوں۔ اگر وہ ایسا کر سکے ہیں تو براہ کرم بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو انھوں نے تیار کئے ہیں تاکہ ان کے نمونے سے دوسرے لوگ بھی ویسا ہی بننے کی کوشش کریں۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکے تو وہ اپنی روش کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا نفس دوسروں کی تنقیص میں اس لئے مصروف ہے تاکہ اپنی سہل انگاری ڈھکی رہے اور اسے چھپانے کے لئے اس نے بلند

نصب العین کو آڑ بنا رکھا ہو۔ فریب نفس سے اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں باادب گزارش کریں گے کہ وہ زمانہ کے حالات کی روشنی میں اپنے مسلک پر نظرِ ثانی فرمائیں۔ اور اگر ہو سکے تو کام کرنے والوں کے ساتھ مل کر کچھ کام کریں۔ جہاں اصلاح کی ضرورت ہو اصلاح کریں۔ جہاں احتیاط کی ضرورت ہو انہیں متنبہ کریں۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم اس قسم کے تخریبی مسلک سے تو احتراز فرمائیں۔ یہ غریب مسلمانوں پر بڑا کرم ہوگا۔

جس طرح **تاج محل** جس طرح آج سے تین سو سال پہلے۔ آج بھی اسی طرح تر و تازہ اور شگفتہ و شاداب ہے۔ اسی طرح بعض کتابیں بھی زندہ رہنے والی ہوتی ہیں اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ان کی قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے۔ اسی قسم کی کتابیں محترم پرویز صاحب کی زندہ جاوید تصانیف

سلیم کے نام خطوط

اور

انسان نے کیا سوچا

ہیں۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں ان کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔

ان کتابوں نے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں صحیح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

انسان نے کیا سوچا؟ ———— قیمت ۱۲ روپے

سلیم کے نام خطوط (تین خوبصورت جلدوں میں) جلد اول ۸ روپے جلد دوم ۶ روپے جلد سوم ۶ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷ بی ——— شاہ عالم مارکٹ لاہور

احتساب (قسط نمبر ۷)

مسئلہ کشمیر اپنی ایام میں وزیراعظم پاکستان نے دلی پہنچ کر مسئلہ کشمیر سے متعلق وزیراعظم نہرو سے مذاکرات کئے۔ وزیراعظم پاکستان نے واپسی پر ان مذاکرات کے بارے میں پاکستانی عوام کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا لیکن جو صورت حال سامنے آئی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے "مذاکرات کشمیر" کے عنوان سے طلوع اسلام نے لکھا:

.....لیکن اس کے باوجود پنڈت جی نہ مانے۔ وہ مانتے بھی کیسے؟ وہ تو ایک ہی بات مان سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ پاکستان اپنے آپ کو ان کے قدموں میں ڈال دے۔ ہمارے وزیراعظم ابھی یہاں تک نہیں پہنچے لیکن جس طریق سے وہ ۱۹۵۳ء سے اپنے "بڑے بھائی" کے سامنے رفتہ رفتہ ہتھیار ڈالتے جا رہے ہیں۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ایک دو ملاقاتیں اور ہوئیں تو یہ پیشکش بھی کر دی جائے گی..... ہم وزیراعظم صاحب سے پوچھتے ہیں کہ اگر آپ نے (بقول آپ کے) پنڈت نہرو کو واقعی قریب سے دیکھا ہے تو کیا پھر بھی آپ کی آنکھیں نہیں کھلیں؟..... ہم وزیراعظم سے باادب گزارش کریں گے کہ کشمیر ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے اگر ہندوستان اس پر معقول بات کرنے اور سننے کو تیار نہیں تو اس سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ رکھا جائے..... ایسے ملک سے دوستی اپنے آپ سے دشمنی ہے جو ہماری شاہ رگ پر قابض ہے لیکن ہمیں جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے۔

ہم وزیراعظم سے یہ بھی گزارش کریں گے کہ وہ ازراہ کرم قوم کو صاف صاف بتائیں کہ وہ دلی میں کیا کر کے آئے ہیں۔ اگر وہ قوم پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تو انہیں قوم سے بھی جوابی تعاون کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ انہوں نے اپنے بیان میں پریس سے درخواست کی ہے کہ وہ ان کے بارے میں تعاون کرے۔ ہم حیران ہیں کہ ہم سے کس قسم کے

تعاون کی توقع کی جارہی ہے۔ کیا ہم کشمیر کو ذبح ہوتے دیکھیں اور لب کشائی نہ کریں، اگر تعاون سے مراد یہ کچھ ہے تو ہم مجبور ہیں کہ اس اپیل پر مطلقاً کان نہ دھریں۔ آپ اس قسم کا تعاون پتھروں سے حاصل کر سکتے ہیں، ذی احساس انسانوں سے نہیں۔ (شمارہ ۲۸ مئی ۵۵ء صفحہ ۶)

شرمناک ہنگامہ نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے سلسلے میں پنجاب کے سیاسی کرمفرما جن شرمناک ہنگامہ آرائیوں پر اتر آئے تھے وہ ملک کے مستقبل کے لئے تباہی کا پیش خیمہ تھیں۔ طلوع اسلام کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس صورت حال کو خاموشی سے گوارا کر لیتا۔ اس نے پہلے مختلف لیڈروں کی باہمی آویزش اور جنگجوئی کی اخباری رپورٹ کو "بطور نمونہ" پیش کیا اور پھر "عرصۂ محشر" کے عنوان کے تحت لکھا۔

یہ نمونہ ہے گالی گلوچ کے اس گھناؤنے کھیل کا جس میں پنجاب کے قائدین مصروف ہیں۔ یہ ڈرامہ کیوں کھیلا جا رہا ہے۔ آخر یہ بیٹھے بیٹھے کیا ہو گیا کہ اس حمام میں سبھی ننگے نظر آ رہے ہیں یہ شرمناک ہنگامہ صرف اس بات پر اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ پنجاب کو مجلس دستور ساز کے لئے نامزد منتخب کرنے ہیں۔ دیوانے کی ہو کی طرح، بات جو چل نکلی ہے تو کسی کے منہ سے کلمۂ خیر نہیں نکلتا۔ اس کے نزدیک وہ غدار۔ اُس کے نزدیک یہ مردود ازلی۔ یہ کیا عذاب مسلط ہو گیا کہ ہر شخص آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کی بجائے دوسرے کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھ رہا ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کہ سبھی صورتیں مسخ ہو گئی ہیں اور ہر شخص حبشی کی طرح آئینے میں اپنا ہی چہرہ دیکھ رہا ہے لیکن سمجھ رہا ہے کہ اس میں شیطان بیٹھا ہے۔

ہمیں رونا ان مسخ شدہ چہروں کا نہیں بلکہ ماتم اس کا کرنا ہے کہ یہی سیاہ چہرے کل کو ایک جگہ جمع ہوں گے تو اپنے آپ کو مجلس دستور ساز کا نام دیں گے اور ان کے ذمہ فریضہ یہ ہو گا کہ وہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے لئے شایانِ شان دستور مرتب کریں۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر ز خاک
سر برآرد ایں قیامت در میانِ خلق ہیں

(شمارہ ۳ جون ۵۵ء صفحہ ۵)

اس کے بعد طلوع اسلام کسی قدر تفصیل سے ارباب سیاست کی طالع آزمائیوں کی تصویر پیش کرتا ہے اور اس ضمن میں لکھتا ہے۔

وزارتیں چلتی پھرتی چھاؤں ہوتی ہیں۔ وہ بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ نہ ان کے آنے کی خوشی ہونی چاہیئے نہ جانے کا غم۔ کیونکہ "امم را از شہاں پائندہ تر داں" کے مصداق دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس آمد و رفت میں ملک اور قوم کا کیا بنتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں سیاسیات پاکستان کا جائزہ لیجئے تو یہ رنجیدہ حقیقت روح کی گہرائیوں میں لرزہ بپا کر دیتی ہے کہ بساطِ سیاست پر چند شاطر بیٹھے ہیں جو جوڑ توڑ اور ہار جیت میں لگے رہتے ہیں ان کے ذاتی مصالح اور شخصی مفادات کے مطابق ملک کی قسمت کے پانسے پلٹتے رہتے ہیں اور اگر ملکی سیاست ہر وقت متزلزل اور تعاون ناآشنا رہتی ہے تو کسی اساسی خرابی کی بدولت نہیں بلکہ محض انہی اصحاب غرض و ارباب ہوس کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے اور یہ ریشہ دوانیاں محض اس وجہ سے نہیں ہو رہیں کہ ہمارے سیاست دان جاہ و منصب کے بھوکے ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کی طرف سے ان پر کسی قسم کا احتساب نہیں۔ ہر ابن الوقت مفاد خویش کا تحفظ کرتا ہے اور اسے تقاضائے ملی قرار دیتا ہے۔ (ایضاً)

اُلٹی زقند

مشرقی پاکستان میں گورنری راج کا قیام اور مولوی فضل الحق صاحب (مرحوم) کی وزارت کا خاتمہ کرتے ہوئے اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان نے اعلان کیا تھا کہ مولوی صاحب غدار ہیں اور ایسے شخص کی وزارت کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن ۲ر جون ۱۹۵۵ء کو پارلیمانی زندگی بحال کرتے ہوئے اسی وزیر اعظم نے پھر مشرقی پاکستان کی حکومت کو فضل الحق گروپ کی تحویل میں دے دیا۔ محلاتی سازشوں کا یہ شاہکار ایک ایسی بے اصولی کا مظہر تھا جسے گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس پر

"اے عقل چہ می گوئی۔ اے عشق چہ فرمائی؟"

کے عنوان سے طلوع اسلام نے لکھا۔

> ۴ر جون کو وزیر اعظم محمد علی نے ڈھاکہ سے مشرقی پاکستان میں پارلیمانی احیاء کا اعلان کرتے ہوئے سارے ملک کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اس سے گستاخی معاف، یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہیں نہ صوبے کا مفاد عزیز ہے نہ ملک کے مفاد کا پاس۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزیر اعظم صاحب یہ تہیہ کر کے ڈھاکہ پہنچے تھے کہ اب کی بار نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر وہ مشرقی پاکستان کی جاگیر مولوی صاحب کو بخش دیں گے۔

یہ مولوی فضل الحق صاحب کون ہیں؟ ہم ان کے متعلق ذاتی معلومات کی بنا پر کچھ

نہیں بکھتے مگر گزشتہ سال ہمارے وزیر اعظم صاحب نے قائد اعظم کے فرمودات کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا تھا کہ مولوی صاحب "غدار" ہیں اور وہ اس قابل نہیں کہ انہیں وزیر اعظم رہنے دیا جائے۔ اس وقت سے لے کر اب تک ملک بھر میں انتظار رہا کہ مولوی صاحب کے خلاف جو الزامات ہیں ان کی تحقیق و تفتیش ہوگی۔ اور اگر ان کا جرم ثابت ہو گیا تو انہیں قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ واضح ہے کہ کسی ملک میں غداری سے بڑھ کر کوئی اور جرم نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا.......

لیکن اب اچانک یہ کیا ہو گیا کہ وزیر اعظم نے صوبہ بھر کی نہیں۔ ملک بھر کی قسمت کا سودا انہی مولوی صاحب سے کر لیا۔؟ ... اگر وزیر اعظم نے اپنی ذاتی جاگیر کے متعلق اس قسم کے سودے کئے ہوتے تو ہم ان کے لئے کبھی لب کشائی نہ کرتے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ پاکستان کسی کی جاگیر نہیں۔ اور کسی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اسے جسے جی چاہے یوں ہی بخش دے خواہ وہ غدار ہی کیوں نہ ہو۔ ہم وزیر اعظم صاحب سے استدعا کریں گے کہ اگر انہیں ان سیاسی روباہ بازیوں سے کبھی فرصت ملے تو وہ ذرا خلوت میں بیٹھ کر سوچیں کہ ان کے فیصلے کے نشتر کی زد کہاں تک پہنچتی ہے۔ یہ پارلیمانی احیا نہیں بلکہ ملک کی بربادی کے سامان ہیں۔ اس ملک کی تباہی کے سامان جس کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اسے جس کے سپرد جی چاہے کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ ایک نخاس میں بکنے والے غلام کی طرح ساکت و صامت اور بیکس و بے بس کھڑا ہے اور ایک حرف بھی زبان پر نہیں لا سکتا۔ (شمارہ ۱۱ جون ۱۹۵۵ء ص ۶)

پاکستان کی نئی دستوریہ

جون ۱۹۵۵ء میں نئی مجلس دستور ساز کا انتخاب عمل میں آیا۔ سیاسی پارٹیوں کے گٹھ جوڑ۔ محلاتی سازشوں اور شعبدہ بازیوں کی بدولت جس قسم کے نمائندے کامیاب ہو کر سامنے آئے ان کی اکثریت قطعاً اس منصب عظیم کی اہل نہ تھی۔ اس صورت حال کا ماتم کرتے ہوئے طلوع اسلام ۲ جولائی ۱۹۵۵ء کے افتتاحیہ میں لکھتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ ان افراد میں جو اب منتخب ہو کر آئے ہیں اور ان میں جو مرحوم مجلس کے اراکین تھے، دل و دماغ اور فکر و کردار کے اعتبار سے کوئی نمایاں فرق نہیں۔ لہٰذا جہاں تک آئین سازی کا تعلق ہے (ایک اسلامی مملکت کی آئین سازی کو تو چھوڑئیے۔ عام مملکتوں کی آئین سازی کے نقطۂ نگاہ سے بھی) ان حضرات سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرنا

اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا اور بالآخر مایوس ہونا ہے۔ آئین سازی اور جہاں بانی جیسے اہم فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے ایسے افراد منتخب ہوکر آگئے ہیں جو شاید اپنا نام لکھنا بھی نہ جانتے ہوں.....

حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم اس قدر بانجھ نہیں ہوئی کہ اس میں صاحبانِ فکر و کردار کے پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ قوم میں اچھے اچھے ذی استعداد لوگ موجود ہیں۔ لیکن پارٹی بازی کی میکیاولی ابلیسیت ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور جب تک یہاں فکر کی تبدیلی اور سیاسی شعور کی بیداری پیدا نہیں ہو جاتی آپ جتنے انتخابات جی چاہے کرا لیجئے نتیجہ ایک جیسا رہے گا۔ (ص۳)

یہ کچھ لکھنے کے بعد طلوعِ اسلام ان نمائندگانِ ملک کو ان کے ملکی اور ملی فریضہ پر متوجہ کرتا ہے اور لکھتا ہے۔

اس کے باوجود ہماری ان حضرات سے پُرزور درخواست ہے (اور یہ درخواست قلب کی گہرائیوں سے ابھر کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے صفحۂ قرطاس تک آئی ہے) کہ آپ کچھ وقت کے لئے خالی الذہن ہو کر سوچیں کہ وہ کس قدر اہم عظیم اور گراں قدر فریضہ ہے جسے آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس وسیع و عریض مملکت کے استحکام و بقا اور اس میں بسنے والے سات آٹھ کروڑ نفوس کی زندگی اور سرفرازی کا مدار اس آئین پر ہے جس کی ترتیب و تدوین کا بارِ گراں آپ نے ازخود اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے۔ اگر آپ نے اپنی اس ذمہ داری کا صحیح صحیح احساس کیا تو اس سے نہ صرف ملتِ پاکستانیہ کی موجودہ نسل ہی آپ کی زیرِ بار احسان ہوگی بلکہ آنے والی نسلیں بھی جو آپ کے لگائے ہوئے شجرِ طیب کے سائے تلے بیٹھ کر آرام کریں گی اور اس کے حسین و شاداب پھل کھائیں گی آپ کو ہمیشہ دعائیں دیتی رہیں گی۔ (ایضاً)

نئی دستوریہ کے کھیل تماشے

نئی دستوریہ کے قیام کے بعد حکومت نے ضروری سمجھا کہ اس مجلس کے اہم کام کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس کے اجلاس کا انتظام مری کی پُرفضا اور پُرسکون بلندیوں پر کیا جائے۔ اس کے لئے مری کے کلب ہال میں ضروری انتظامات کئے گئے۔ کراچی سے فرنیچر وغیرہ منگوانے پر الگ بے پناہ رقوم خرچ ہوئیں لیکن مجلس نے اپنے تین ہی دنوں کی ہنگامہ آرائیوں کے بعد اس اجلاس کے غیر معین التوا کا فیصلہ کر دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی طے کر دیا کہ آئندہ سے مجلس دستور ساز کے اجلاس کراچی میں ہوں۔ مملکت کے نمائندوں کی یہ مضحکہ خیزیاں اس قدر ناقابلِ برداشت تھیں کہ طلوعِ اسلام

نے "تماشا گاہ مری" کے عنوان سے ان کھیل تماشوں کی پرزور مذمت کرتے ہوئے لکھا۔

کوئی غایت درجہ کا شقی ہوگا جو یہ یقین کرے گا کہ یہ قوم کے وہ فرزند ہیں جنہیں قوم نے اس لئے منتخب کرکے یہاں بھیجا ہے کہ وہ اہم فریضہ کو سرانجام دیں جو آٹھ سال تک سرانجام نہیں دیا جا سکا اور جسکے بغیر اُن کا ملک سرزمین بے آئین بھلا رہا ہے۔ کیفیت کار سے صرف نظر کرکے اگر ہم محض کمیت کار کو دیکھیں تو بھی بار ندامت سے سر جھک جاتا ہے .... چار اجلاس منعقد کرکے مری کو خیر باد کہہ دینا غایت درجہ کی معاملہ ناقہمی اور بداندیشی ہے۔ اگر مری کا انتخاب صحیح تھا اور وہ جگہ کام کے لئے موزوں ترتھی تو اس کے بدلنے کی کوئی وجہ نہ ہونی چاہیئے تھی۔ اور اگر یہ انتخاب غلط تھا تو حکومت نے تبدیلی کے مطالبے کے باوجود جو ضد کی وہ ناقابل فہم اور درخور مذمت ہے .... اگر حکومت کو مری کلب کی سرپرستی مقصود تھی تو اسے عطیہ دیا جا سکتا تھا۔ اگر ارکان دستوریہ کو مری کی سیر کرنے کا شوق تھا تو ان کے لئے دوسری صورتیں بھی پیدا کی جا سکتی تھیں۔ لیکن یہ کیا ضرور تھا کہ ملک اور قوم سے مذاق کیا جائے۔ اس ضیاع اور زیاں کے لئے ہم تنہا حکومت کو ذمہ دار قرار نہیں دیتے۔ اس جرم میں ارکان مجلس دستور ساز بھی شریک ہیں جو مواخذہ سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔

سطور بالا میں ان امور کی طرف توجہ دلانے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ اب بھی اس گھناونے کھیل کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اور کامل توجہ سے پیش نظر کام کو نبٹایا جا سکتا ہے۔ اگر کراچی میں بھی یہی داستان دہرائی گئی تو جدید مجلس دستور ساز بھی سابقہ مجلس سے بہتر سلوک کی مستحق نہیں رہے گی۔ اور اس کا ٹھکانہ بھی اسی قبرستان میں ہوگا۔ جہاں اس کی پیش رو کا مدفن ہے۔ کس قدر سوختہ بخت ہے یہ ملک اور کتنے بے نصیب ہیں اس ملک کے رہنے والے، ان واقعات سے بار بار یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جس ملک کے سیاسی شعور اور قومی کردار کا یہ عالم ہو اسے جمہوریت راس آ ہی نہیں سکتی۔

(شمارہ ۱۴، جولائی ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۵)

۳ ستمبر ۱۹۵۵ء کی (ہفت روزہ) اشاعت میں طلوع اسلام کو پھر یہی تلخ اور جگر سوز موضوع چھیڑنا پڑا۔ "ہمارے لیڈر" کے عنوان سے اس نے مجلس دستور ساز کے اراکین کی فتنہ انگیز روش کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھا۔

قوم کو بددلی کے جہنم میں دھکیل کر ارباب سیاست ملک کے مفاد سے جو کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس کی بدترین مثال جدید مجلس دستور ساز کی کارگزاری ہے .... اور یہ کچھ کرنے والے کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں قوم نے اس لئے منتخب کیا ہے کہ وہ ملک کے لئے کم سے کم وقت میں آئین وضع کریں۔ کیونکہ سات طویل سالوں میں آئین مرتب نہ ہو سکنے کی وجہ سے قومی معاملات میں گوناگوں پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں اور ملک ایک عظیم بحران سے دوچار ہو گیا ہے۔ اگر گزشتہ دو ماہ کی کارگزاری کو دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجلس دستور ساز عمر بھر اپنا فریضۂ منصبی ادا نہیں کر سکے گی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہو گا کہ ان نام نہاد آئین سازوں پر سے ملک کا اعتماد ختم ہو جائے گا۔ اور عام بددلی پھیلے گی۔ اور دوسرا یہ کہ ملک کا کوئی مسئلہ طے نہیں ہو گا اس سے بددلی کو اور تقویت پہنچے گی۔ پاکستان آج اسی عذاب میں مبتلا ہے۔ اور اس کی ذمہ داری ارباب سیاست پر ہے۔ خواہ وہ حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہوں یا محرومین کے گروہ میں شامل۔ ان حالات میں ملک کا سب سے بڑا محسن وہ ہو گا جو اسے اس دلدل سے نکال کر لے جائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس چمن میں کوئی ایسا دیدہ ور ہے یا نہیں۔

وحدت مغربی پاکستان کی خودغرضانہ مخالفت

۲۳ اگست ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کی وحدت (ONE UNIT) کا مسودہ دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوا اور دنیا نے یہ عجیب تماشا دیکھا کہ اس سے قبل، جن قومی نمائندوں نے پنجاب، سرحد اور سندھ کی اسمبلیوں میں اس تجویز کو خود منظور کرایا تھا۔ وہی اب اس کی مخالفت میں دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ اس کی وضاحت اور اس ذہنیت کا ماتم کرتے ہوئے طلوع اسلام نے ۱۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا۔

اب تک کم و بیش تیس ارکان (دستور ساز اسمبلی میں) اس کے متعلق تقریریں کر چکے ہیں۔ ان میں خاصی تعداد حزب مخالف کی بھی ہے۔ آپ ان تقریروں کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ ان میں کوئی اختلاف بھی اصول پر مبنی ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ چند ذاتی مخاصمتیں ہیں جو تجویز کی مخالفت میں ابھر ابھر کر سامنے آ رہی ہیں۔ اور سامنے بھی اس سوقیانہ انداز سے

آ رہی ہیں. جس سے خود جمہوریت کی آنکھیں زمین میں گڑ جائیں۔ ۲۲ اگست سے اس وقت تک کا عرصہ اسی ایک مسئلہ کی نذر ہو گیا۔ اگر اس تجویز کو رائے عامہ کے لئے مشتہر کیا گیا تو پھر اس مسودہ پر شق "بر شق" بحث ہو گی۔ یہ بحث کس قدر طول پکڑے گی اس کا اندازہ اس سے لگا ہے کہ ایک شق کے ساتھ سینکڑوں ترمیمات منسلک کر دی گئی ہیں۔ ہم تو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اس انداز اور اس رفتار سے یہ مجلس دستور سازی کے معاملہ میں کیا کام کر سکے گی۔ ملک اس پہ رو رہا ہے کہ سابقہ دستور یہ نے سات سال ضائع کر دیئے۔ لیکن اگر لیل و نہار یہی ہیں تو یہ دستور یہ ستر سال میں بھی دستور مرتب نہیں کر سکے گی۔

(طلوع اسلام - ۱۷ ستمبر ۱۹۵۵ء صہ)

مغربی پاکستان کی وحدت ضروری کیوں؟

اس افتتاحیہ کے آخر میں طلوع اسلام نے اس امر کی وضاحت کی کہ وحدت مغربی پاکستان کی عملی تشکیل اس کے نزدیک کیوں ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کہا کہ :-

مغربی پاکستان کی وحدت کے لئے ہماری تائید اور کوشش محض اس لئے ہے کہ ہم قرآنی بصیرت کی روشنی میں سمجھتے ہیں کہ یہ اقدام وحدت ملت کے لئے بڑا ساز گار ثابت ہو گا۔ اور اس سے قرآنی نظام ربوبیت کے قیام کا راستہ نسبتاً آسان ہو جائے گا باقی رہا بعض صوبوں کا یہ خدشہ کہ اس سے ان کا کلچر مٹ جائے گا تو ہمارے ہاں جس قدر بھی مروجہ کلچر ہیں ان میں کوئی بھی اسلامی نہیں۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ ہم ان غیر اسلامی کلچرز کے تحفظ کی فکر کرتے رہیں ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ جلد از جلد مٹ جائیں اور ان کی جگہ ایک نیا کلچر وجود میں آ جائے۔ جو خالص قرآنی خطوط پر متشکل ہو اور ہم اپنی آنے والی نسلوں کو لات و منات کہنہ کا روایتی کلچر ورثہ میں دینے کی بجائے ان کے لئے نو متشکل قرآنی کلچر ترکہ میں چھوڑیں۔ ارباب بصیرت سے ہماری درخواست یہ ہے کہ وہ سرحدی۔ پنجابی اور سندھی تصورات زندگی اور روایتی ثقافت کے خیال کو چھوڑ دیں اور اللہ نے ہمیں جو ایک موقع فراہم کیا ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک متحدہ اور جامع اسلامی تصور حیات اور قرآنی ثقافت کی طرح ڈالیں سہ

وقت آنست کہ آئین دگر تازہ کنیم

لوح دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم (اقبالؒ)

نہیں آتا کہ ان ذہنوں کے متعلق کیا کہا جائے۔ جن میں مخلوط انتخاب کا یہ باطل افروز تصور پیدا ہوا۔ ان زبانوں کے متعلق کن الفاظ میں گفتگو کی جائے۔ جنہوں نے اس اسلام دشمن فتنے کو آگے پھیلایا اور ان ہاتھوں کا ذکر کس انداز سے کیا جائے جو اس زہر آلود خنجر کو سینۂ ملّت میں پیوست کرنے کے لئے یوں بے باکانہ اٹھ رہے ہیں۔ (شمارہ ۱۹۔ نومبر ۵۵ء صـ۳)

اس کے بعد قومیت کے اسلامی تصور کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے قرآن اور تاریخ دین کی روشنی میں طلوع اسلام نے واضح کیا ہے کہ اسلام میں قومیت کا مدار آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہے۔ وطن، رنگ، یا نسل وغیرہ کی کسی اساس پر ہرگز نہیں۔ افتتاحیے کے آخر میں اس نے اراکین دستور ساز اور کارفرمایانِ مملکت کو بایں الفاظ متنبہ کیا۔

....اگر دستور میں مخلوط انتخاب جیسے غیر اسلامی تصورات کو ٹھونس دیا گیا تو ہم واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ یہ روش زیادہ عرصہ تک نہیں سکے گی۔ ... اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے اصولوں سے انحراف کے باوجود جس دستور کو آپ اسلامی کہہ کر مرتب کریں گے قوم اسے اسلامی سمجھ کر سر آنکھوں سے لگالیگی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ ایسے مقام پر اقبال کی ہمنوائی میں یہ کہنے والے اب بھی موجود ہیں کہ

غلامم جز رضائے تو نجویم | جز آں راہے کہ فرمودی نپویم
ولیکن گر بایں ناداں بگوئی | خرے را اسپ تازی گو، نگویم

(ایضاً صـ۵)

ہماری قومی نشر گاہیں

قومی نشر گاہ (ریڈیو اسٹیشن) ایک مملکت کی تعمیر نو اور عوام کی ذہنی تربیت میں جو معرکہ سرانجام دے سکتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے ممکن نہیں۔ لیکن ریڈیو پاکستان کے ارباب انتظام نشریات کی صورت میں جو کچھ پیش کرتے چلے آرہے تھے وہ اس نوزائیدہ مملکت اور اس کے عوام کی تعمیر و تربیت کے بجائے مایوس کن ذہنی عیاشیوں کا سرچشمہ ثابت ہو رہا تھا۔ تاریخ کی بساط پر ابھرتی ہوئی ایک نئی مملکت اور نئی قوم کے نشوونما اور ارتقاء سے یہ مضحکہ خیزی ناقابل برداشت تھی۔ طلوع اسلام نے اس معاملے میں حتی الامکان ضبط سے کام لیا اور آخر ایک دن اس کا قلم حرکت میں آ ہی گیا۔ ریڈیو پاکستان کے ارباب انتظام کی ذمہ داری اور اس کی اہمیت واضح کرنے کے بعد اپنے مقالہ میں اس نے لکھا۔

ریڈیو عوامی تعلیم و تربیت کا ایک عمدہ اور موثر ذریعہ ہے۔ اس کی افادیت ان علاقوں میں

خصوصیت سے بڑھ جاتی ہے جو پسماندہ اور غیر تعلیم یافتہ ہیں کیونکہ اسکول کی تعلیم کا ذریعہ بہر حال دقت طلب بھی ہے اور وقت طلب بھی۔ ریڈیو گاؤں گاؤں میں نصب کر کے کسی آواز کو ملک کے گوشے گوشے میں اور ایک ایک فرد تک پہنچایا جا سکتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارا ریڈیو یا تو برسر اقتدار حکومت کا نقیب ہے اور یا عوام کو ان کی موجودہ سطح پر جمائے رکھنے کا ذریعہ۔ یہی اس نے وزیروں کے بیانات اور تقریریں نشر کرنے اور حکومت کے اقدامات اور منصوبوں کی قصیدہ خوانی کرنے ہی کو اپنا فریضہ زندگی بنائے رکھا۔ ایسی مثالیں کم ملتی ہیں کہ اس نے ان مقاصد کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہو جو قیام پاکستان کا محرک ثابت ہوئے اور جن کی تکمیل کے بغیر پاکستان کا مطلب کچھ نہیں ہوگا۔ جہاں تک اس کے مذہبی اور فنون لطیفہ سے متعلق پروگراموں کا تعلق ہے اس کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ ان میں کوئی ایسی بات نہ آنے پائے جس سے عوام کا معیار بلند ہو سکے۔ اس کے برعکس اسے پست سے پست سطح تک لے جایا جائے اس کی ذمہ داری ان وزیروں پر عائد ہوتی ہے جو وقتاً فوقتاً اس کا انصرام سنبھالتے رہے اور اس حکومت پر بھی جس کے وہ وزیر یا ارکان تھے۔ ہمیں افسوس ہے کہ پاکستان کی مختلف حکومتوں نے اس پر مطلقاً توجہ نہیں دی کہ ریڈیو کے ذریعہ پاکستان کے طول و عرض میں زندگی کی نئی لہر دوڑائی جا سکتی ہے۔ اور عوام کی ذہنی و قلبی سطح کو بلند سے بلند تر کیا جا سکتا ہے انہوں نے اسے ذاتی اور احزابی ضروریات کے لئے استعمال کیا۔ اور بس۔ (شمارہ ۱۹ نومبر ۵۵ء)

شاہ سعود اور کشمیر

نومبر میں شاہ سعود کے دورۂ بھارت کی خبر منظر عام پر آئی اور اس کے ساتھ یہ بھی فرسا اطلاع بھی کہ انھوں نے مقبوضہ کشمیر کو بھی اپنے دورے میں شامل کر لیا ہے مرکز اسلام کے یہ حکمران اس سے قبل پاکستان کے مفاد کے خلاف جس روش کا ثبوت دے چکے تھے اور اس کی روشنی میں ان کا دورۂ کشمیر جن افسوسناک نتائج پر منتج ہو سکتا تھا۔ طلوع اسلام نے اسے منظر عام پر لانا فروری سمجھا۔ مسئلہ کشمیر کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اس نے شاہ سعود کو ایک حقیقت کشا انتباہ کیا اور لکھا۔

"اسرائیل اور کشمیر" دونوں عالم اسلامی کے رستے ہوئے ناسور ہیں۔ پاکستان نے ان دونوں خطروں کو بھانپ لیا ہے اور ان کے مقابلے کے لئے وہ پوری طرح تیار ہو رہا ہے لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑے گا کہ دیگر ممالک مسلمہ نے بالعموم اور ممالک عربیہ نے بالخصوص

کشمیر کے تباہ کن مضمرات کو کما حقہ محسوس نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب جہاں یہودی سلطنت کو زندگی اور موت کا سوال سمجھتے ہیں وہاں کشمیر کو چنداں شائستہ اعتنا نہیں سمجھتے۔ حالانکہ بادنیٰ تعمق دونوں مسائل کے مسلمانانِ عالم کے لئے، زندگی اور موت کے مسائل ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

یوں تو کسی مسلمان ملک کی طرف سے بے اعتنائی کا مظاہرہ ہو، ہمارے لئے وہ قلبی اضطراب کا باعث ہوگا۔ لیکن جب شاہ نجد و حجاز بھی اس رو میں بہہ جائیں تو ہیجان و اضطراب کی حد نہیں رہتی۔ کیونکہ متولیٔ کعبہ ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت بڑی قابلِ احترام ہے۔۔۔۔ عرب سے اس شیفتگی نے شاہ عرب کو مخصوص حیثیت عطا کر دی ہے۔ فلہٰذا انہیں اپنے قول و فعل میں بڑا محتاط ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ان کا اثر مسلمانانِ عالم پر کہیں گہرا پڑتا ہے۔ اندریں حالات شاہ سعود کا کشمیر جانے کا فیصلہ بڑا کرب انگیز ہے۔ اور یہ تاثر مسلمانان پاکستان کا ہی نہیں ان مظلومین کشمیر کا بھی ہے جو آٹھ سال سے ہندوستانی مظالم بے پناہ کا شکار چلے آ رہے ہیں۔

(شمارہ ۲۶ نومبر ۵۵ء ص۵)

یہ حقائق و تاثرات پیش کرنے کے بعد طلوع اسلام، اسلامی اخوت کے تقاضوں کی بنا پر دعوتِ فکر دیتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ۔

ہم شاہ سعود سے یہ پوچھنے کی جسارت کرتے ہیں کہ اگر کہیں وزیر اعظم پاکستان "اسرائیل" کا دورہ کرنے جائیں تو ان کے قلب پر کیا گزرے گی۔ اگر وہ اس کو برداشت نہیں کرتے تو اہلِ پاکستان ان کے کشمیر کے دورے کو بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کے دل میں ان کا اس قدر احترام ہے کہ پچھلے دنوں جب انہوں نے ان ترکی جہازوں کو عربی علاقے میں اترنے یا اس پر سے گزرنے کی اجازت نہیں دی جو پاکستان کے سیلاب زدگان کے لئے ضروری امداد لا رہے تھے تو انہوں نے آف تک نہیں کی تھی اب اگر وہ حرفِ شکایت زبان پر لا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب وہ خاموش نہیں رہ سکتے۔ (ایضاً)

جمہوریت اور اسکی کارفرمائیاں

جمہوریت کی بحالی کا نعرہ ہمارے ہاں آج بھی بڑے زور و شور سے بلند ہو رہا ہے۔ اور سالہائے گزشتہ میں بھی اس کے نعرے

فضا میں مرتعش ہے۔ لیکن جمہوریت ہے کیا؟ اس کے متعلق کوئی واضح تصور ہمارے ہاں عوام کے سامنے نہ لایا جا سکا۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۵۵ء کے طلوعِ اسلام میں یہی اہم موضوع، واقعات و حقائق کی روشنی میں سامنے آیا۔ طلوعِ اسلام نے اس اجمال کی تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھا۔

> جمہوریت ڈیماکریسی (DEMOCRACY) کا ترجمہ ہے۔ اس کے معنی ہیں "لوگوں کی حکومت" یا "عوام کی حکومت" اس کا مفہوم انگریزی کے اس مشہور فقرے میں ادا کیا جاتا ہے۔ جو امریکی دستور کی بنیاد قرار دیا گیا ہے یعنی "عوام کی حکومت، جو عوام کے فائدے کے لئے، خود عوام کے ہاتھوں سے" مغربی اقوام میں، جمہوری حکومت فی الواقعہ عوام کی حکومت، عوام کے فائدہ کیلئے، خود عوام کے ہاتھوں تشکیل پاتی ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق دو آراء ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہشت سالہ تجربہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ یہی ہے کہ یہاں حکومت نہ عوام کی ہوتی ہے نہ عوام کے فائدے کیلئے ہوتی ہے اور نہ ہی عوام کے ہاتھوں تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ یہ خواص کی حکومت، خاص مفاد کی خاطر خواص کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے۔ (شمارہ ۱۷ دسمبر ۱۹۵۵ء صٓ۳)

اس نے یہ بھی بتایا کہ ہمارے ہاں جمہوری نظامِ حکومت کی بدولت کس قسم کے "تلخ" نتائج سامنے آئے۔ سنئے!

> گزشتہ آٹھ برس سے خود ہمارے ہاں جمہوری نظامِ حکومت کار فرما ہے۔ ہم اللہ کے فضل و کرم سے براہِ راست اس کے عواقب و ثمرات سے لذت اندوز ہو رہے ہیں ہماری ملّی حالت، معاملات میں آئے دن کا تجربہ۔ معاشرہ کی چیخ و پکار۔ قوم کی زبوں حالی۔ قدم قدم پر زندگی کی ہڈیاں چٹخنے کی درد انگیز آوازیں حتّٰی کہ خود اس جمہوری حکومت کے اربابِ بست و کشاد کے اعلانات کہ ہمارے ہاں ــــــ رشوت، بد دیانتی، نالائقی، اقربا نوازی، اعزہ پروری، انفرادی مفاد پرستی کی لعنت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم حکمرانوں کے ایک گروہ سے تنگ آکر نئے انتخابات کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن نئے انتخابات کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ انہی جیسا ایک اور گروہ ہم پر مسلط ہو گیا ہے۔ (ایضاً)

پاکستان میں جمہوری نظام سے یہ تلخ ثمرات کیوں مُنتج ہوئے۔ اس اہم سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے انتخابی کوائف کی تفصیل پیش کی اور یہ بتایا کہ

> اس طریقِ کار کا عملی نتیجہ دیکھئے! فرض کیجئے دس گاؤں کا ایک حلقہ انتخاب ہے جس میں پچاس ہزار کاشتکار (مزارع) ہیں اور پچاس زمیندار۔ اس حلقہ کی ایک نشست کے

لئے پانچ زمیندار کھڑے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک امیدوار کامیاب ہوتا ہے جسے کہنے کے لئے یہ زمیندار، ان پچاس ہزار کاشتکاروں کا نمائندہ ہے۔ لیکن سوچئے کہ ایک زمیندار کسی طرح بھی کاشتکاروں (مزارعین) کا نمائندہ بن سکتا ہے۔ زمیندار اور کاشتکار کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں کیا اس صورت میں ایک زمیندار کبھی کاشتکاروں کے مفاد کا محافظ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کارخانوں کی مثال لیجئے...... ان حلقوں کو پھیلا کر، پورے ملک کو محیط کر لیجئے۔ ملک کی آبادی میں نوّے (بلکہ اس سے بھی زیادہ) فی صد غریبوں کا ہے اور باقی دس فی صد (بلکہ اس سے بھی کم) امیر ہیں۔ انتخاب کے لئے (کم و بیش تمام) امیدوار اسی دس فی صد (امراء کے) حلقہ سے کھڑے ہوتے ہیں اور ان میں سے کامیاب امیدوار مجالس مقننہ وغیرہ کے رکن بن جاتے ہیں۔ کیا آپ ان ممبروں کو ملک کی نوے فیصد غریب و نادار آبادی کا نمائندہ قرار دے سکتے ہیں۔ کیا یہ "جمہور" عوام کے مفاد کے محافظ و نگران سمجھے جا سکتے ہیں؟ کیا ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ اپنے مفاد پر عوام (جمہور) کے مفاد کو ترجیح دیں گے؟ لہٰذا جب یہ منتخب شدہ ممبر، جمہور کے نمائندے ہی نہیں تو اس انداز حکومت کو جمہوری (DEMOCRATIC) کہا کیسے جا سکتا ہے؟ (ایضاً)

اس تفصیل کے بعد طلوع اسلام، صورت حال کی اصلاح کے لئے یہ بنیادی حل تجویز کرتا ہے۔

اس فساد کا علاج (ایک بڑی حد تک) انتخابی مشینری کی اصلاح میں ہے اور وہ اصلاح یہ ہے کہ ملک کی سو نشستوں میں سے نوے نشستیں عوام کے لئے مخصوص ہونی چاہئیں، اور دس خواص (امراء) کے لئے۔ عوام (غریبوں) کی نشستوں سے صرف عوام (کاشت کار، مزدور غریب) امیدوار کھڑے ہوں۔ اور خواص کی نشستوں کے لئے خواص (زمیندار، کارخانہ دار امراء)۔ نہ عوام ان خواص کو ووٹ دے سکیں۔ نہ خواص ان عوام کی نشستوں میں دخیل ہو سکیں۔ اس طرح، صرف اس طرح عوام کی صحیح نمائندگی ہو سکے گی۔ اور اس طرح حکومت کو جمہوری (عوام کی) حکومت کہا جا سکے گا۔ (ایضاً)

مسئلہ کشمیر اور روس کا چیلنج

وزیر اعظم چوہدری محمد علی صاحب کی دعوت پر پاکستان کے ہر مکتب فکر کے ممتاز رہنماؤں کی ایک نمائندہ کانفرنس دارالحکومت کراچی میں ہوئی اور سب رہنماؤں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا، کہ کشمیر کو بھارت کے چنگل سے نجات دلانے کے لئے

ٹھوس اقدامات عمل میں لائے جائیں۔ آل پارٹیز کشمیر کانفرنس کے اس اعلان کی روشنائی ابھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ سفارتی آداب کے تقاضوں اور سلامتی کونسل کے فیصلوں کے احترام کو پس پشت ڈال کر روس میدان میں کود پڑا۔ روس کے وزیر اعظم مارشل بلگانن اور وہاں کی کمیونسٹ پارٹی کے آمر مطلق مسٹر خروشیف نے جو انہی ایام میں بھارت اور افغانستان کے دورے پر آئے تھے، پے در پے پاکستان کے خلاف یہ بیان بازی شروع کر دی کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے، اس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا، اور دوسری طرف پاکستان کے دوست (امریکہ وغیرہ) جن کی خاطر پاکستان کو اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑا، منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ یہ صورت حال بڑی نازک تھی اور اس کا تجزیہ اشد ضروری۔ اس فریضہ کو ادا کرتے ہوئے طلوع اسلام نے ۱۰ دسمبر کے ایک مقالہ میں لکھا۔

> کشمیر کا مسئلہ پاکستان اور ہندوستان کے مابین متنازعہ فیہ ہے اور جب تک اس کا فیصلہ نہیں ہو جاتا کسی ملک کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے کسی ایک ملک کا حصہ قرار دے۔ روس کے تعلقات ہندوستان سے ہیں تو پاکستان سے بھی۔ اس لئے ڈپلومیٹک آداب کا تقاضا ہے کہ اس کے دل میں جو کچھ بھی ہو، وہ بات غیر ذمہ داری سے نہ کرے۔ نیز کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کے پیش نظر بھی ہے اور روس اس ادارے کا رکن ہونے کی حیثیت سے مجبور ہے کہ ایسی واضح جانبداری کا مرتکب نہ ہو۔ لیکن روس نے نہ پاکستان سے ڈپلومیٹک تعلقات کا لحاظ کیا۔ نہ اقوام متحدہ کی رکنیت کی ذمہ داری کو محسوس کیا۔ ان حدود کا احترام ایک طرف، وہ بالکل آپے سے باہر ہو گیا اور پاکستان کی تخلیق ہی پر معترض ہونے لگا۔ مہذب ممالک اس قسم کے اعلانات کو ضروری بھی سمجھیں تو اس وقت کرتے ہیں جب وہ برسرپیکار ہوتے ہیں۔ لیکن روس کے رنگ نیارے ہیں، وہ قاعدے کے مطابق پاکستان کا دشمن ہے۔ (جب تک دونوں ممالک کے مابین سفارتی تعلقات قائم ہیں انہیں ایک دوسرے کا دشمن نہیں کہا جا سکتا)۔ لیکن وہ اس کی اساس تک پر اعتراض کرنے سے نہیں چوکا۔ اگر روس پاکستان کو اس نظر سے دیکھتا ہے، تو اسے تعلقات منقطع کر کے اپنے آپ کو یا وہ گوئی کے لئے آزاد کر لینا چاہیئے۔ (۱۰ دسمبر ۵۵ء — ص۵)

اس کے بعد آزادی کشمیر کے پرجوش قومی عزم کا اعلان کرتے ہوئے تجزیے کا یہ رخ امریکہ اور حکومت پاکستان کی طرف مڑتا ہے اور زندگی دعوت کے اس اہم مسئلہ میں وہ مصلحت پسندی کے تار و پود بکھیرتے ہوئے لکھتا ہے :—

سوال پیدا ہوتا ہے کہ روس کے اس صریح اعلان کے بعد امریکہ کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے؟ یہ سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ ہم کشمیر کی قسمت امریکہ کے ہاتھ میں سمجھتے ہیں، بلکہ اس لئے کہ ہم پر روسی عتاب کا نزلہ اس لئے گر رہا ہے کہ ہم امریکہ کے حلیف ہیں۔ اگر ہمیں امریکہ سے حلیفانہ تعلقات قائم کرنے کی یہ سزا مل سکتی ہے، تو ہم امریکہ سے یہ توقع کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ وہ صاف صاف بتائے کہ وہ ہمیں کیا مقام دینے کے لئے تیار ہے۔؟ ..... اگر امریکہ نے صاف طور پر پاکستانی موقف کی حمایت نہ کی تو پاکستان اپنے لئے جداگانہ راستہ تراشنے پر مجبور ہو جائے گا۔ امریکہ اگر یہ چاہتا ہے کہ پاکستان اس کا ساتھ دے تو اسے چاہئے کہ وہ یہ موقع پیدا ہونے نہ دے کہ پاکستان اضطرار کچھ کر بیٹھے .....

امریکہ اس کا کچھ بھی جواب دے۔ پاکستان کی حکومت اور عوام کو یہ راز سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ کشمیر بڑی شدت سے ہمارے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے کشمیر مظہر بن گیا ہے ان مخالفانہ سازشوں کا جن کا جال ہندوستان اور روس بچھاتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا کشمیر ہماری قومی جدوجہد کا فیصلہ کن معرکہ ہوگا۔ اسے سر کرنے کے لئے کامل اتحاد و یکجہتی کی ضرورت ہے۔ جو افراد و احزاب کشمیر کا نفرنس میں شریک ہوئے تھے اگر ان کی شرکت واقعی خلوص پر مبنی تھی اور وہ کشمیر کے حصول کے لئے دیانتدارانہ تڑپ رکھتے ہیں تو اب وقت آگیا ہے کہ وہ اس مقصد کے لئے یک زبان، یک نگاہ اور یک جان ہو جائیں کہ

یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ (ایضاً)

اگلے شمارہ میں طلوع اسلام کو ایک بار پھر پاکستان کی زندگی اور موت کے اس اہم مسئلہ پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی اور اقوام متحدہ اور امریکہ کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے لکھا:

اس کے جواب میں انہیں (اقوام متحدہ اور امریکہ کو) بتانا ہوگا کہ وہ اس چیلنج کے تقاضے کیسے پورے کریں گے۔ مثلاً کیا اقوام متحدہ اس کے لئے تیار ہے کہ چونکہ روس نے کشمیر کے بارے میں فریق مقدمہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے اس لئے اس معاملے میں اسے رائے دینے کا حق نہیں دیا جا سکتا؟ یا کیا امریکہ اس کے لئے تیار ہے کہ ہندوستان اب بھی استصواب سے پہلو تہی کرے تو اقوام متحدہ کو اس آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے قواعد کے مطابق اس رکن ملک کے خلاف مناسب کارروائی

کرے؟ اگر وہ اس موثر عملی اقدام کے لئے تیار نہیں تو پاکستان کی زبانی ہمدردی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کشمیر پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اب جبکہ ہم اس مرحلے تک آپہنچے ہیں کہ ایک روس نہیں، کئی روس بھی آدھمکیں تو ہمیں اس آگ میں کودنے سے نہیں رک سکتے۔ یہ آگ ہماری زندگی کو موت کے گھاٹ اتارے گی یا اسے زندہ تر کرے گی۔ ہمارا عمل اس کا خود فیصلہ کردے گا۔ اس کے متعلق ہم امریکہ کو یہ جتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ پاکستان، روس کی روشن کی ہوئی آگ کی نذر ہوگیا، تو امریکہ کو بھی ان شعلوں سے یقیناً پناہ نہ مل سکے گی۔

(شمارہ ۴، ۲ دسمبر ۵۸ء — صفحہ ۱۶)

بڑھتی ہوئی انتظامی خرابیاں

ملک کی انتظامی مشینری کی بڑھتی ہوئی خرابیاں باعث ہیجان و اضطراب بنتی جارہی تھیں اور ہر شخص کے لبوں پر یہ سوال ابھر رہا تھا کہ حکومت ان خرابیوں کی اصلاح پر توجہ کیوں نہیں دے رہی؟ طلوع اسلام نے ایک اہم مقالہ میں اس سوال کا جواب دیا۔ مقالہ کا عنوان تھا ———— تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی؟

سنئے! اس مقالہ میں اس نے لکھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ نظم و نسق کی خرابیوں کی وجوہات متعدد ہیں لیکن ان میں ایک وجہ ایسی ہے جو بالکل بین ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمارے ارباب اقتدار کو اس کا علم اور احساس ہی نہیں ہوتا کہ عوام کن مشکلات سے دوچار ہیں اور انکی زندگی کس طرح سے اجیرن ہو رہی ہے..... زندگی کے کسی گوشہ کو بھی لیجئے اس کے متعلق حاکم اعلیٰ کو کبھی معلوم ہی نہیں ہونے پاتا کہ عوام کو کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انکے اپنے کام بغیر کسی قسم کی دقت اور دشواری کے سرانجام پاتے جاتے ہیں۔ عوام کی حالت سے باخبر رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ان حضرات کا عوام کیساتھ ربط ہے۔ وہ اپنے آپکو عوام میں کا ایک، اور عوام انہیں اپنے میں کا ایک سمجھیں۔ لیکن اس قسم کا ربط تو ایک طرف۔ ان میں اور عوام میں اسقدر بُعد اور بیگانگی ہوتی ہے کہ عوام کی کوئی بات انکے گوش مبارک تک پہنچ ہی نہیں سکتی........ یاد رکھئے! جن لوگوں کے ہاتھوں میں عوام کی تقدیریں دی جائیں جب تک وہ سمیع و بصیر اور خبیر و علیم نہ ہوں وہ اپنی ذمہ داریوں سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ وہ ہر شکایت کے جواب میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ لوگ نظم و نسق کی خرابیاں بیان کرنے میں خواہ مخواہ کا مبالغہ کرتے ہیں۔ ان سے کون کہے کہ

تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی ٭ تپیدن دل مرغان رشتہ بر پا را

(شمارہ ۱۵، ۳۱ دسمبر ۵۵ء — صفحہ ۱)